ماہنامہ

رفیقِ منزل

نئی نسل کا معمار اور تعمیر و ترقی کا داعی

جلد: ۳۱ | شمارہ: ۲ | فروری ۲۰۱۸ء | جمادی الاول ۔ جمادی الآخر ۱۴۳۹ھ

editor@rafeeqemanzil.com

MANAGER
Bilal Khan 9029194433
managerrmgp@sio-india.org

Asst. MANAGER
Abdul Jabbar 08447622919
asst.managerrmgp@sio-india.org

₹160 سالانہ | ₹15

D-300, Abul Fazl Enclave Jamia Nagar, Okhla New Delhi - 110025 | Tel: 26949817 | Email:managerrmgp@sio-india.org | www.rafeeqemanzil.com

Printed on behalf of The Students Islamic Organisation ofIndia, Printer & Publisher Tanveer Alam, Printed at Bharat Offset, 2034/35, Qasim Jan Street, Ballimaran, Delhi - 110006, Published from 230, Abul Fazl Enclave, Jamia Nagar, Okhla, New Delhi - 110025 | **Editor : Abul Aala Sayyed**

درجات کی بلندی

ڈاکٹر وقار انور

عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ: إن الرجل لیکون لہ عنداللہ المنزلۃ فما یبلغھا بعمل فلایزال اللہ یبتلیہ بما یکرہ حتی یبلغہ ایاھا۔ (السلسلۃ الصحیحۃ، حدیث نمبر: ۲۶۵۱)

''ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، انھوں کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مومن آدمی کا اللہ تعالی کے یہاں ایک مرتبہ اور درجہ ہوتا ہے، جس پر وہ اپنے عمل کے ذریعہ نہیں پہنچ سکتا۔ اللہ تعالی اسے ایسی چیز کے ساتھ جسے وہ ناپسند کرتا ہے، آزماتا رہتا ہے، حتیٰ کہ اسے اس درجہ پر پہنچا دیتا ہے۔''

اللہ تعالی نے اپنے ہر بندہ مومن کو ایک ایسا مقامِ بلند عطا کرنے کا ارادہ کیا ہے جسے وہ خود اپنے عمل سے حاصل نہیں کرسکتا۔ یہ حدیث بتاتی ہے کہ خود اپنے عمل سے حاصل ہونے والے معمول کے مقام سے زیادہ عطا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ بندوں کو امتحان میں مبتلا کرتا رہا ہے اور اس طرح سے ہر امتحان میں کامیاب ہوتے ہوتے بندہ اس اونچے مقام تک پہنچ جاتا ہے جس کا اللہ نے اس کے حق میں ارادہ کرلیا ہوتا ہے۔

اس طرح اس حدیث سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ بندہ مومن کو اپنی دنیا کی زندگی میں جن آزمائشوں سے گزرنا ہوتا ہے وہ سب اللہ تعالی کے اس ارادے کے تحت ہے کہ وہ ان سے کامیاب گزر کر اللہ تعالی کو راضی کرلے اور بہترین اجر کا مستحق ہوجائے۔ حدیث میں یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ یہ آزمائشیں بندہ مومن کو بظاہر ناگوار گزرتی ہیں لیکن وہ حقیقتاً اس کے حق میں ہوتی ہیں۔

حدیث میں جو باتیں بتائی گئی ہیں اس کا مقصد یہ ہے کہ زندگی میں آنے والی مصیبتوں سے انسان گھبرا نہ جائے بلکہ اسے اس بات کا اطمینان حاصل ہو کہ ساری مشکلات اس ربِ کائنات کی اذن سے ہیں، جوان کے ذریعے اسے اپنے سے زیادہ قریب کرنے کا موقع دے رہا ہے تاکہ جنت میں اس کا درجہ بہت زیادہ بلند ہو۔

دیگر احادیث کے مطالعہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جنت کا حصول کسی بندے کے صرف اپنے عمل سے ممکن نہیں ہے بلکہ اس کے اعمالِ صالحہ کو قبول کر کے اللہ تعالی اپنے فضل وکرم سے اس میں برکت دیتا ہے اور وہ جہنم کی آگ سے بچ کر جنت کے باغوں تک پہنچ جاتا ہے۔ درج بالا حدیث میں اس حقیقت سے آگے کی بات بتائی گئی ہے کہ بندۂ مومن جنت میں بھی اعلیٰ تر مقام تک پہنچ سکتا ہے اگر اس نے دنیا کی زندگی میں آنے والی مصیبتوں اور امتحانات کا خندہ پیشانی سے سامنا کیا ہوگا۔

دراصل یہ حدیث مسلمانوں کے لیے تسلی کا باعث ہے۔ جب ایک شخص یہ دیکھتا ہے کہ اپنے ایمان کے درست ہونے اور عمل صالحہ پر کاربند ہونے کے باوجود دنیا میں وہ پریشان ہے اور دوسری طرف وہ لوگ جنھیں ایمان و عمل کی دولت نصیب نہیں ہے، خوش وخرم ہیں، تو ایک بندۂ مومن کے ذہن میں یہ بات آسکتی ہے کہ کہیں اس کا خدا اس سے ناراض تو نہیں ہے اور اس طرح سے اس کا ایمان و عمل ضائع تو نہیں ہو رہا ہے۔ اس طرح کا خیال اگر ایک انسان کو اپنے ایمان کو مزید پختہ کرنے اور عمل کو مزید بہتر بنانے کی طرف راغب کردے تو یہ خیال مطلوب ہے لیکن اگر اس طرح کے خیال سے مایوسی پیدا ہوتی ہو تو یہ شیطانی وسوسہ ہے۔ یہ حدیث ایسے موقع پر انسان کو تسلی دیتی ہے کہ اس کا خدا اس کے ساتھ ہے اور جو پریشانیاں اور مشکلات درپیش ہیں وہ دراصل اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائشیں ہیں، جن سے اگر وہ حسنِ عمل کے ساتھ گزر گیا تو یہ اس کے لیے توشۂ آخرت ہوں گی۔

یہ حدیث اور اس مفہوم سے مماثل قرآنی آیات اور دیگر احادیث مسلمانوں کو ہمت دلاتی ہیں کہ وہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے خیر کی امید کے ساتھ ہر طرح کے حالات میں ثابت قدم رہیں۔ دنیا کی یہ پریشانیاں بظاہر جتنی بھی سخت محسوس ہوتی ہوں لیکن ہیں وہ چند روزہ زندگی کے چھوٹے موٹے واقعات۔ آخرت کی ہمیشہ کی زندگی کے موازنے میں ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے اور پھر جو بھی واقعات پیش آرہے ہیں وہ از خود نہیں ہو رہے ہوتے ہیں، بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہوتے ہیں اور اس کی مشیت کا جزء ہیں۔

خودکشی ۔ اللہ سے خیانت

اسلام نے انسانی جان کو بے انتہا معزز گردانا ہے۔اسی لئے کسی ایک شخص کی جان کے ناحق قتل کرنے کو پوری انسانیت کا قتل قرار دیا ہے۔اللہ تعالیٰ نے زندگی عطا کی ہے اور وہ ہی اسے ختم کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی زندگی کو ختم کر کے اسی کی دی ہوئی امانت میں خیانت کا مرتکب ہو۔کیونکہ قرآن کی رو سے مومنین کے جان و مال اللہ تعالیٰ نے جنت کے عوض خرید لئے ہیں ۔ پھر ایک مسلمان کے نزدیک صرف دنیاوی زندگی ہی نہیں بلکہ آخرت کی دائمی زندگی مقصود ہوتی ہے وہ سمجھتا ہے کہ ہر مصیبت و پریشانی اللہ کی طرف سے ہوتی ہے اور وہی اسے ختم کرسکتا ہے۔اسی لئے اسلام میں خودکشی حرام قرار دی گئی ہے جبکہ دوسری طرف موجودہ دنیا میں مادی ترقیات ،اور ہر قسم کی آرام وآسائش کے باوجود خودکشی کا تناسب بڑھ رہا ہے۔تشویشناک بات یہ ہے کہ خودکشی کا یہ تناسب نوجوان نسل میں زیادہ ہے۔ ۱۵، سے ۲۹،سال کے نوجوانوں میں خودکشی ،اموات کی دوسری سب سے بڑی وجہ ہے۔ پہلے صرف غریب عوام ہی خودکشی کرتے تھے پر آج کی دنیا میں مصنّفین ، وکلاء، امراء،شرفاء،مشہور ومعروف ہستیاں اور بڑے کاروباریوں تک سبھی افراد اقدام خودکشی کے مرتکب نظر آتے ہیں۔

خوکشی کے لاتعداد محرکات ہیں ۔جس میں غریبی ،بھوک مری، خاندانی اور معاشرتی عدم استحکام،عدم تحفظ ،احساس کمتری، ذہنی خلجان،سماجی عدم مساوات ، ناکامی ، مایوسی اور ناامیدی وغیرہ قابل ذکر ہیں ۔لیکن خودکشی کی اہم وجہ اور اس کی پہلی سیڑھی ذہنی تناؤ یعنی ڈپریشن(Depression) ہے۔آرام وآسائش اور ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی تگ ودو میں آج کا انسان ذہنی تناؤ کا مریض بن گیا ہے۔لیکن یہ ذہنی تناؤ جب آگے بڑھ کر زیادہ مایوسی وناامیدی کو جنم دیتا ہے تو خودکشی کے خیالات ذہن میں پیدا ہوتے ہیں ۔جو انسان کو اقدام خودکشی تک لے جاتے ہیں ۔ذہنی تناؤ اور خودکشی پر قابو پانے کے لئے بات چیت یعنی گفتگو اور کونسلنگ نہایت موثر نسخہ ہے۔دنیا کے بہت سے ادارے کونسلنگ کے ذریعہ ہی خودکشی پر قابو پانے کی کوشش کررہے ہیں ۔ یہ ادارے خودکشی کے خیالات رکھنے والے افراد کو آزادانہ گفتگو کا موقع فراہم کرتے ہیں ۔انہیں جج کرنے کی بجائے ان کے مسائل کا حل تلاش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔تاکہ وہ ذہنی تناؤ سے لڑکر باہر نکلیں ۔ عالمی ادارہ صحت (WHO) صحت سے متعلق کسی سنگین مسئلہ پر ہر سال ایک Theme کے تحت کام کرتی ہے۔ WHO نے سال ۲۰۱۷ کو ذہنی تناؤ پر بیداری پیدا کرنے کے لئے مختص کیا تھا۔جس کا تھیم Depression-let's talk تھا۔دراصل امت وسط ہونے کے ناطے امت مسلمہ کے صالح نوجوان وطلبہ اس کے زیادہ حق دار ہیں کہ وہ ان اداروں وتنظیموں سے زیادہ انسانیت کے خیر خواہ بن کر ابھریں اور خودکشی کے اس بھنور سے انسانیت کو نجات دلائیں۔

اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں ذہنی تناؤ کے حل کے طور پر صبر کو پیش کرتا ہے۔قرآن فرماتا ہے’’اور ہم ضرور تمھیں خوف وخطر،فاقہ کشی ، جان و مال کے نقصانات اور آمدنیوں کے گھاٹے میں مبتلا کرکے آزمائیں گے۔ان حالات میں جو لوگ صبر کریں اور جب کوئی مصیبت پڑے تو کہیں کہ ہم اللہ ہی کے ہیں۔اور اللہ ہی کی طرف ہمیں پلٹ کر جانا ہے۔انہیں خوشخبری دے دو۔ان پر ان کے رب کی طرف بڑی عنایات ہوں گی۔(البقرہ:۱۵۶) آیت میں رجوع الی اللہ اور صبر کو خودکشی کے سدباب کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔خودکشی کے متبادل کے طور پر صبر کی بہترین مثال حضرت ایوبؑ کے اسوہ مبارک میں ہمیں سیکھنے کو ملتی ہے۔آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم خودکشی کے اسباب ووجوہات کو سمجھ کر اس کے حل کرنے کی طرف اقدام کریں تاکہ انسانیت کی اس مسئلہ پر مدد کی جاسکے۔

تم سے کیا رکھے کوئی منصفی کی امیدیں !!

چیف جسٹس دیپک مشرا نے کئی ایسے اہم مقدموں کی سنوائی کے لئے اپنی مرضی کے جج صاحبان کو مقرر کیا۔ اس کی بنیاد یہ رہی کہ وہ عدالت عالیہ کے ۲۶ ججس میں پہلے نمبر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور صرف اس معمولی بنیاد پر انہوں نے اپنی مرضی کے فیصلے سنوانے کی غرض سے پہلے سے مقرر کردہ ایک بینچ کے فیصلوں کو کالعدم قرار دیا، اور اس کی جگہ اپنا فیصلہ نافذ کیا۔ ہندوستانی دستور کی دفعات کو ہر جج اپنی مرضی کے مطابق سمجھ کر فیصلہ دے سکتا ہے۔ اس لئے ہر جج کا ذاتی میلان اور فیصلہ سازی سے متعلق فضاء کا فیصلہ پر زبردست اثر ہوتا ہے۔ یعنی ہم یقینی طور سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ جج کا فیصلہ ہر دم انصاف پر مبنی فیصلہ ہوگا۔

اس قسم کی دھاندلیاں بڑی آسانی سے کی جاسکتی ہیں اور بڑی آسانی سے عوام کی نظر میں بھی آسکتی ہیں۔ مثلاً نوٹ بندی سے متعلق جب سپریم کورٹ میں عرضی برائے مفاد عامہ اس بناء پر دائر کی گئی کہ حکومت کو کسی صورت عوام کی ذاتی ملکیت کو سلب کرنے کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ لیکن اس عرضی سے متعلق سماعت کو اب تک ملتوی رکھا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ بہت سے مقدمے اس سے قبل دائر کئے گئے ہیں جس کی وجہ سے اس مقدمہ کی سنوائی کا نمبر ابھی نہیں آیا ہے۔ اس قسم کی دیری، چیف جسٹس اور دیگر عدلیہ کے جج صاحبان کے لئے دھاندلی کرنے کا خوب موقع فراہم کرتی ہے۔ تین طلاق سے متعلق مقدمہ کی سنوائی کے ضمن میں بھی ہر جج کی ذاتی حیثیت نے ان کے فیصلہ پر زبردست اثر ڈالا۔ اور ان میں سے ہر ایک نے دستور کی ایک مختلف تعبیر کو پیش کیا۔ خاص بات یہ ہے کہ ججس کے تقرر کے سلسلے میں میڈیا میں بھی اور دیگر دانشوران کے نزدیک بھی یہ بات بڑی اہمیت کی حامل تھی کہ پانچوں جج حضرات مختلف مذاہب کے ماننے والے تھے۔ گویا سیکولرزم اور مذہب بیزاری کے اصولوں پر کام کرنے والی عدلیہ کے لئے بھی مذاہب کی نمائندگی کا ہونا ایک لازمی امر ہے۔ اور انصاف کی فراہمی کے لئے ہم جج حضرات پر بھی بھروسہ نہیں کرسکتے کہ وہ اپنے ذاتی میلان سے ہٹ کر ٹھیٹھ انصاف پر مبنی فیصلہ کریں گے۔

اس پر مستزاد ایک اور ڈرامہ جس میں اس قسم کی دھاندلیوں کا برسرِ عام تذکرہ کیا گیا وہ ہے چار سینئیر جج حضرات کی وہ پریس کانفرنس۔ چاروں معزز جج صاحبان نے بالآخر ہندوستان کی 'انصاف پرور' عدلیہ کا بھانڈہ پھوڑ ہی دیا۔ انہوں نے عمومی رسوم و رواج سے ہٹ کر عوام کی عدالت میں اپنی مظلومی کا مقدمہ پیش کیا۔ ان کی اس حرکت سے ہندوستانی جمہوریت کا ایک اور ستون متزلزل ہوگیا ہے۔ نظام قانون سازی تو بربادی اور ظلم و بربریت پر مبنی تھا۔ انتظامیہ رشوت اور اقرباء پروری پر۔ اور میڈیا، تو میڈیا کا کیا کہنا۔ اس نظام کے تابوت میں آخری کیل اس نظام عدلیہ کی نا اہلی اور کمزوری نے ٹھوک دی ہے۔ ہندوستانی جمہوریت کے علاوہ، ہندوستانی دستور کی بھی چولیں ہل چکی ہیں۔ آزادی، مساوات، سیکولرزم، انصاف ان تمام تصورات کی دھجّیاں اڑادی گئی ہیں۔ ہندوستان کا نظام، ہر ایک انسانی مرضی اور ہوائے نفس کی بناء پر چلنے والے نظام کی طرح زبردست بربادی کی طرف گامزن ہے۔ سوال یہ ہے کہ اب ہمیں اس نظام کو بربادی سے بچانا ہے۔ یا اس نظام کو مکمل تبدیل کرنا ہے؟

دودھ تو ڈبے کا ہے، تعلیم ہے سرکار کی !!

کسی بھی ملک کی ترقی کا انحصار ملک کے اقتصادی اور تعلیمی معیار سے لگایا جاسکتا ہے۔ یوں تو ملک کی ترقی میں کئی عوامل کارفرما ہوتے ہیں لیکن اقتصادی نظام اور تعلیمی نظام ملک کی ترقی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ لیکن بات ہمارے ملک ہندوستان کی کی جائے تو یہاں کا تعلیمی نظام طلباء کو اور جہالت کی تاریکیوں میں ڈھکیلنے کا مکمل تہیہ کئے ہوئے نظر آتا ہے۔

ASER (Annual Status of Education report) 2017 کی سروے رپورٹ ہندوستانی تعلیمی نظام کی خستہ حالی اور طلباء کی تعلیم کے تئیں رجحان کو پیش کرتا ہے جو کہ ملک کے باشعور طبقہ کے لئے فکرمندی کا موقع ہے۔ اسیر ASER کا یہ سروے ملک کے دیہی علاقوں کے تعلیمی معیار کو معلوم کرنے کے لیے 2017 میں تقریباً 24 ریاستوں کے 28 اضلاع میں کیا گیا۔ رپورٹ کے مطابق 18-14 سال کی عمر کے بچوں کا 86% حصہ ابھی بھی رسمی تعلیمی نظام میں یا تو اسکول یا کالج میں تعلیم حاصل کررہا ہے۔ اسی عمر کے بچوں کے نصف فیصد نے دسویں یا اس سے کم جماعت میں اپنا نام درج کروایا، 25% نے گیارہویں یا بارہویں اور 6% نے گریجویشن اور انڈر گریجویشن میں اپنا نام اندراج کروایا۔ اس کے علاوہ 14% نے ابھی تک کسی بھی جماعت میں داخلہ نہیں لیا۔ رپورٹ کے مطابق 18-14 سال کی عمر کے بچوں کا ایک چوتھائی حصہ اپنی مادری زبان میں صحیح طور سے گفتگو نہیں کرسکتا۔

رپورٹ کا یہ حصہ انتہائی شرمناک اور قابل توجہ ہے۔ جب بچوں کے سامنے ملک کا نقشہ رکھا گیا تو ان میں سے 14% طلباء ملک کے نقشے کی شناخت بھی کرنے سے قاصر ہیں، 36% طلباء کو ملک کے صدر مقام کا نام نہیں مل سکا اور 21% طلباء اپنی ریاست کا نام بھی نہیں کہہ سکے۔ چیف اکنامک اڈوائسر اروند سبرامنیم نے اس رپورٹ کے مشاہدہ کے بعد کہا کہ ''یہ حالت انتہائی حیران کن ہے اور غور کرنے پر آمادہ کرتی ہے کہ کیا چل رہا ہے اور کیا ہونا چاہیے تھا''۔ یہ رپورٹ روزمرہ کے بنیادی کاموں کو لیتے ہوئے بنائی گئی جس میں رقم کی گنتی، وزن معلوم کرنا اور وقت کا بتانا جیسے کام شامل ہیں۔ طلباء کا تقریباً ایک چوتھائی حصہ پیسوں کی صحیح طور سے گنتی کرنے میں ناکام ہے، 44% طلباء کیلوگرام میں وزن بتانے اور 40% طلبا روزمرہ کا بنیادی کام گھنٹوں اور منٹوں میں وقت بتانے سے قاصر ہیں۔

اس کے علاوہ کئی اور میدان ہیں جن میں طلباء کی ناقص کارکردگی رپورٹ کی گئی جس کا تفصیلی جائزہ ASER کی ویب سائٹ پر کیا جاسکتا ہے۔ اس رپورٹ سے حکومت کی تعلیم اور ملک کے مستقبل کے تئیں فکرمندی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ حکومت کو صرف ہندو مسلم اور مسجد مندر کی سیاست سے غرض ہے۔ حکومت کا یہ غیر سنجیدہ طرز عمل ملک کے لئے نقصاندہ ثابت ہورہا ہے۔ مروجہ تعلیمی نظام اپنے آپ میں ایک ناقص العمل نظام ہے مزید حکومت کا یہ طرز عمل کہ وہ تعلیمی نصاب کو زعفرانی رنگ میں رنگنے کی کوشش میں ہے جو کہ سوائے نفرت کی ترویج کے اور کچھ نہیں۔ حکومت کو چاہیے کہ وہ منصفانہ طرز پر معیار تعلیم کو بلند کرنے کے لیے سنجیدگی سے غور کرے اور ملک کے ماہر تعلیمی اداروں کے دانشوروں اور علم دوست احباب کے مشوروں سے نظام تعلیم کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کرے۔

مکرمی!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ماہ دسمبر کا رفیق منزل ملا، فہرست مضامین میں مختلف عناوین نظر آرہے تھے وہیں یکایک میری نگاہ ڈاکٹر محی الدین غازی صاحب کی تحریر خطبہ جمعہ کی زبان اور زمانے کی پکار پر پڑی تو کچھ وقت کے لئے سکتہ طاری ہو گیا اور اجتہاد کی شکلیں ذہن میں تازہ ہو گئیں فوراً مضمون کو پڑھنا شروع کر دیا۔ ابتداء تحریر میں بہترین و محتاط انداز میں موجودہ نظام تعلیم کی ناکامی کو واضح کر دیا اور مادیت کی جڑ کی شکل میں موجودہ عصری تعلیم کو پیش کر دیا، فارغین مدارس کے لئے مفید مشورے بھی تحریر میں نظر آئے، ڈاکٹر صاحب کا انداز تحریر ''کوئی فقہی بحث چھیڑنا نہیں ہے'' عمدہ رہا اور مسلک احناف میں کوئی بھی مستند کتاب میں خطبہ جمعہ عربی میں ہی ہو اس کا کوئی ذکر بھی نہیں ملتا ہے۔ دوران مطالعہ سماجی صورت حال آنکھوں سے گزر رہی تھی جس میں امام صاحب منبر سے صرف عربی زبان میں خطبہ دیتے نظر آرہے تھے اور ڈاکٹر صاحب پر رشک ہو رہا تھا کہ کس طرح حقیقت بیانی کے ساتھ مضمون تحریر کیا گیا ہے لیکن مضمون میں مجھے احساس ہوا کہ ''خطبہ جمعہ مقامی زبانوں میں ہو اس کے لئے طلبہ و نوجوان کس طرح جدوجہد کریں؟'' اس بات کا بھی ذکر ہوتا تو اور بھی بہتر ہوتا۔ امید ہے آئندہ تحریر میں مقامی زبان میں خطبہ جمعہ اور سماجی ذمہ داری پر گفتگو ہوگی ... جزاکم اللہ خیراً کثیرا

شعیب اقبال خان
عمرکھیڑ مہاراشٹر

محترم جناب مدیر صاحب!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

رفیق منزل کا تازہ شمارہ ماہ دسمبر 2017 نظر سے گذرا۔ علمی، تحقیقی اور تجزیاتی مضامین زیر مطالعہ آئے بڑی خوشی ومسرت کی بات تو یہ ہے کہ شمارہ ہر طرح سے رنگین اور دلکش دکھائی دیا۔ بہت ہی شاندار، معلوماتی اور پروقار۔ گزشتہ ماہ کا بھی شمارہ دل کو بھا گیا تھا۔ مگر اس ماہ کا شمارہ لاجواب ہے۔ اس ماہ کے مجلہ میں جتنے بھی مضامین ہیں سب نے اپنے اپنے موضوع کا حق ادا کر دیا جس کی جتنی ستائش کی جائے کم ہے۔ شمارہ کے مطالعہ کے بعد اس کی اشاعت پر دیر سے ہی سہی مگر وقت اور حالات کے پیش نظر میں مدیر اور ان کی پوری ٹیم کو مبارکباد دیتا ہوں کہ وہ ایسے حالات میں جب کہ ہماری نوجوان نسل ماہ ناموں اور شماروں سے دوری اختیار کرتی جارہی ہے جس کے سبب مطالعہ کے رجحان میں کمی واقع ہو رہی ہے نوجوان نسل کو سامنے رکھ کر دلچسپ، معیاری اور لاجواب شمارہ شائع کر رہے ہیں، جو گویا جوئے شیر لانا ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ یہ شمارہ کامیابی کے اعلیٰ مدارج پر پہنچ جائے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ آپ کو اور اس سے جڑے تمام احباب کی صلاحیتوں کو برقرار رکھے اور ہر ماہ ''رفیق منزل'' کو عمدہ سے عمدہ بنائے۔ ایک تجویز ہے کہ مضمون نگار کے نام ساتھ اگر مضمون نگار کی تصویر بھی ہو تو بہتر رہے گا۔

محمد فرحان اجمل
مانو، حیدرآباد

نظر

خودکشی

سماجی اور نفسیاتی مباحث کی روشنی میں

شمس الضحیٰ

خودکشی مایوسی، احساس کمتری اور بزدلی کا انجام ہوتی ہے۔ یہ ساری منفی صفات انسانی ذہن کو ماؤف کردیتی ہیں۔ تب انسان راہِ فرار اختیار کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمت عظمٰی کو اپنی حماقت سے ضائع کردیتا ہے۔ خودکشی نہ صرف کفرانِ نعمت ہے بلکہ خیانت بھی ہے۔ کیونکہ یہ زندگی اللہ تعالیٰ کی امانت ہے، اس پر کسی کو بھی مالکانہ حق حاصل نہیں ہے۔ مالک تو اس کا خالق ہی ہے، جس نے پیدا کیا، جس نے اس میں روح پھونکی۔ خودکشی نہ صرف کفران نعمت ہے بلکہ اخلاقی اور معاشرتی جرم بھی ہے۔ یہ وہ ناپسندیدہ عمل ہے کہ کسی بھی مذہب میں اس کی اجازت نہیں ہے۔ حتیٰ کہ انسانوں کے خودساختہ قوانین میں بھی اقدام خودکشی قابل سزا جرم ہے۔ تعزیراتِ ہند کی دفعہ ۳۰۹ میں اقدام خودکشی کی سزا ایک سال کی قید یا جرمانہ یا دونوں ہوسکتی ہے۔ دفعہ ۳۰۵ میں بچوں یا فاتر العقل کو خودکشی کی ترغیب دینے یا کسی بھی طرح سے ان کی خودکشی میں تعاون کرنے پر سزائے موت یا قید کی سزا ہوسکتی ہے۔ اس کے علاوہ وہ جرمانے کا بھی مستوجب بھی ہوگا۔ دفعہ ۳۰۶ میں عام لوگوں کو ارتکاب خودکشی میں کسی بھی طرح کا تعاون کرنے پر دس سال کی قید یا جرمانہ یا دونوں سزائیں دینے کا اختیار عدالت کو حاصل ہے۔

خودکشی کے حق میں دلائل:

خودکشی کو عام طور سے غلط غیر اخلاقی اور ناپسندیدہ جرم مانا جاتا ہے۔ تمام مذاہب اور تہذیبوں میں اس کی مذمت کی گئی ہے۔ لیکن کچھ ظلام الدین روشن خیال اور کج فہم دانشور خودکشی کو جرم، ناپسندیدہ عمل یا غیر اخلاقی نہیں مانتے۔ مثال کے طور پر اپنے زمانے کے معروف وکیل Minoo Masani اپنے ایک انٹرویو میں کہتے ہیں: ”میں سمجھتا ہوں کہ ہر انسان ایک بااختیار شخصیت کا مالک ہے۔ لہٰذا اس کو یہ طے کرنے کا تنہا اس کو حق بھی حاصل ہے کہ وہ زندہ رہنا چاہتا ہے یا نہیں۔ اس کے بارے میں سماج، ریاست کوئی فیصلہ نہیں کرسکتا۔“

Minoo Masani نے ایسا اس لیے کہا کہ انہیں صراط مستقیم نہیں ملا۔ ان کی نظر میں انسانی جانوں کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ منومسانی کو بمبئی ہائی کورٹ کے اس فیصلے نے بھی قوت گویائی بخش دی، جس میں کہا گیا ہے کہ انسان کو آئینی طور پر زندہ رہنے کا حق ملا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس کا مالک ہے۔ وہ جب چاہے اپنے اس حق سے دست بردار ہوجائے۔ وہ اپنی زندگی ختم کرلے۔ فاضل جج نے یہ بھی لکھا کہ ”جو شخص معاشی وسائل سے محروم ہونے کی وجہ سے اپنی زندگی کو ختم کررہا ہے وہ کسی جرم کا ارتکاب نہیں کررہا ہے۔ ریاست جب کفالت نہیں کرسکتی تو خودکشی سے روکنے کا بھی اس کو حق نہیں ہونا چاہیے۔“

خودکشی کو جائز قرار دینے والے یہ بھی کہتے ہیں کہ دنیا کے تمام آئین وقوانین یہ تسلیم کرتے ہیں کہ زندگی انسان کی ملکیت ہے۔ اور جب یہ اس کی ملکیت ہے تو اسے یہ حق حاصل ہے کہ خواہ وہ اسے رکھے یا ختم کردے۔ یہ اس کا ذاتی معاملہ ہے۔ اپنے حق سے رضا کارانہ طور پر دستبردار ہوجانا جرم نہیں ہے۔ اس کو اس کے اس ”حق“ سے ریاست یا سماج محروم نہیں کرسکتا۔ یہ نظریہ محدود اور مادہ پرستانہ ذہنیت کی عکاسی کرتا ہے۔ انسان ایک سماجی جاندار ہے۔ افراد کے اجتماع سے ہی سماج بنتا ہے۔ فرد اور سماج لازم وملزوم ہیں، دونوں کا ایک دوسرے پر انحصار ہے۔ خودکشی کی حمایت بے حسی کی انتہا ہے، جو اتنی عظیم نعمت کے تلف ہونے کا بھی احساس نہیں ہونے دیتی۔

۲۶/اکتوبر ۱۹۸۶ء کو انڈین ایکسپریس میں معروف وکیل فیروز صاحب کا تبصرہ قابل قدر ہے۔ فرماتے ہیں: ”زندگی ریاست کے لیے بھی اتنی ہی قیمتی ہے جتنی اس کے حامل فرد کے لیے۔ لہٰذا کوئی بھی شخص اپنے آپ کو ختم کرنے کی کوشش کرتا ہے تو ریاست اس کو نظر انداز نہیں کرسکتی۔“ چونکہ خالی الذہن دانشوروں کو صراطِ مستقیم کی نعمت حاصل نہیں ہے۔ اس لیے وہ متضاد باتیں کرتے ہیں۔ ایک طرف وہ کہتے ہیں کہ انسان ایک سماجی حیوان ہے۔ ایڈلر (Edler) کہتا ہے کہ چونکہ انسان ایک سماجی حیوان ہے۔ اس لیے اس کی زندگی میں ایک بنیادی شئے سماجی دلچسپی ہے۔ اس کے کردار کا تعین لاشعوری اور فطری قوتیں کرتی ہیں۔ دوسری طرف ان حقائق کا انکار کرتے ہوئے کچھ دانشور خودکشی کو فرد کا ذاتی معاملہ بتاتے ہوئے اس میں سماج یا ریاست کی مداخلت کے مخالف ہیں۔

خودکشی کی وجوہات:

خودکشی کے اسباب ذہنی دباؤ، مایوسی، تشویش، احساسِ محرومی، احساس عدم تحفظ، اندیشے، عدم اعتماد، جارحانہ ومعاندانہ جذبات، احساس ناکامی، حرص وہوس، احساسِ کمتری اور بزدلی ہوتے ہیں۔ اس میں ذاتی شناخت کے مسئلے کا اضافہ بھی ضروری ہے۔ کیونکہ مذکورہ بالا حالات میں Self Concept (اپنی ذات کا تصور) بھی منتشر ہوجاتا ہے۔ یہ بات بھی بہت اہم ہے کہ کشف خیالات اور شخصی اختلال کے نتیجے میں پیدا ہونے والے کردار نے اکثر انسانیت کو بڑا نقصان پہنچایا ہے۔ معاشرے کا جانبدرانہ رویہ، نسلی تناؤ، معاشرے کے مسائل بھی ذہنوں کو بری طرح متاثر کرتے ہیں۔

تین قوتوں کا باھمی تصادم:

انسانی کردار کو ہم سطح سمندر پر تیرتی برف کی چٹان (Ice Berg) سے تشبیہ دے سکتے ہیں۔ جس طرح اس چٹان کا آٹھواں حصہ سطح سمندر پر نظر آتا ہے۔ باقی ماندہ پانی کے اندر ڈوبا ہوا ہوتا ہے۔ اسی طرح کردار کو وجود میں لانے والی قوتوں کا بیشتر حصہ ہمارے لاشعور میں پنہاں ہوتا ہے۔ لاشعور میں پڑی ہوئی نامکمل خواہشات اپنے بالواسطہ یا بلاواسطہ اظہار کے لیے بے تاب ہوتی ہیں۔ ان لاشعوری محرکات کا علم خود صاحب کردار کو بھی نہیں ہوتا۔

شخصیت کو تین قوتیں متحرک کرتی ہیں۔ ایڈ (Id)، انا (Ego) اور فوق الانا (Super Ego)۔ یہ تینوں قوتیں مسلسل متصادم رہتی ہیں۔ اور کردار پر دباؤ ڈال کر اس کے ظہور پذیر ہونے کا سبب بنتی ہیں۔ اپنے ماحول سے موافقت یا عدم موافقت پیدا کرنے والا کردار انہی قوتوں کی کارفرمائی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ یہ تینوں قوتیں لاشعور میں باہم نبردآزما ہوتی ہیں۔ ان کے باہمی ٹکراؤ سے جو کشمکش (Conflict) پیدا ہوتی ہے۔ اس کا حل بھی عموماً لاشعور میں ہی پایا جاتا ہے۔ سگمنڈ فرائڈ کردار کی تعمیر میں طفولیت کے ماحول، حالات اور برتاؤ کو بہت اہمیت دیتا ہے۔

ایڈ، انا اور فوق الانا یہ تینوں قوتیں فرد سے باہم متضاد مطالبات کرتی ہیں۔ اس میں بنیادی تال میل کا فقدان ہوتا ہے۔ ایڈ فرد کی بنیادی قوت ہوتی ہے۔ یہ بچے کے اندر ارتقاء کی پہلی سیڑھی پر ہی موجود ہوتی ہے۔ ایڈ بنیادی طور پر خواہشات کو پورا کر کے راحت حاصل کرنا اور ہر طرح کی اذیت سے دور رہنا چاہتی ہے اور فوری طور پر خواہشات کو پورا کرنا چاہتی ہے۔ حقیقت کا تقاضا کیا ہے اور اخلاقی تقاضے کیا ہیں اس سے اس کو کوئی مطلب نہیں ہوتا۔ اس لیے ایڈ (Id) کی اضطراری تحریک (Impulses) خواہشات کی تکمیل کے گرد گھومتی ہیں۔ وہ محل وموقع اور گردوپیش کے حالات وکوائف کی پرواہ نہیں کرتا۔ وہ انجام سے بے بہرہ ہوجاتا ہے۔ ایڈ حیوانی خواہشات کا ذخیرہ ہے۔ اس میں تشدد کی ایسی شدید خواہش بھی ہوسکتی ہے جو فرد کے قابو سے باہر ہو۔ ایڈ کی اضطراری تحریک ذہنی اختلال پیدا کرنے کا باعث ہوتی ہے۔ تشدد، دوسروں پر حملے، ناپسندیدہ و اضطراری حرکتیں ان کی علامتوں میں شامل ہیں۔ اگر اس کو لگام نہ دی جائے تو انسان کے اندر چھپی ہوئی حیوانی خواہشات کو آزاد کردے گا۔ اور دنیا میں انتشار اور لاقانونیت پھیلانے کا سبب بنے گا۔

دوسری قوت انا (Ego) ہے۔ جو آگہی کے حصول کے ساتھ شخصیت کا خاصہ بنتی ہے۔ ماحول سے مطابقت پیدا کرنے والی یہ سب سے اہم قوت ہے۔ یہ حقیقت پسند ہوتی ہے۔ اس کی رہنمائی دنیاوی حقائق کرتے ہیں۔ یہ ایڈ کے لیے لگام کا کام کرتی ہے۔ لیکن Ego کردار کو قابو میں تو رکھتی ہے مگر انسانی کردار کے اخلاقی پہلو سے اس کو کوئی مطلب نہیں ہوتا۔ اس لیے شخصیت میں ایک تیسری قوت سر ابھارتی ہے۔ جس کو فوق الانا یا Super Ego کہتے ہیں۔ یہ معاشرے، خاندان، والدین اور مذہب سے ملنے والے اخلاقی ضابطوں سے پیدا ہوتی ہے۔ شخصیت کا یہ حصہ Ego کا ہی ایک حصہ ہے۔ جو اس سے الگ ہوکر مثالی انا (Ideal Ego) کے طور پر ابھرتا ہے۔ اس کی ایک اخلاقی قوت کی حیثیت ہے۔ یہ شخصیت کی رہنمائی کرتی ہے۔ اور فرد کے کردار کو اخلاقی قدروں اور صحت مند مقاصد کے حصول کی طرف گامزن کرتی ہے۔ اس کی نوعیت تعمیری ہوتی ہے۔ اور یہ صحت مند سماجی وتہذیبی نشوونما کا سبب بنتی ہے۔

اس طرح ایڈ اور Super Ego متضاد قوتیں ہیں، جو دو انتہا پر ہوتی ہیں۔

انا ان دونوں کے درمیان رہ کر تطبیق (Adjustment) کا کام کرتی ہے۔ یہ ایک ایسا واسطہ ہے جو دو مخالف قوتوں کے درمیان مفاہمت کراتا ہے۔ Super Ego اور Id دو انتہائی قوتیں ہیں۔ ایک بے لگام ہے تو دوسری ضابطوں اور اخلاق کی اس قدر پابند کے ماحول کے مطالبات کے مطابق اپنے اندر لچک نہیں لاسکتی۔ یعنی ایک متشدد ہے تو دوسری اس قدر سنجیدہ کے انسان کو بے عمل بنادے۔ یہ دونوں ہی انتہائی صورتیں ہیں۔ اور صحت و رجحان کی حامل نہیں ہیں۔ ان سے حقائق کی چشم پوشی ہوتی ہے اور زندگی نارمل نہیں رہ جاتی۔ جیسے کسی پر ایڈ حاوی ہو تو وہ بھی ابنارمل کہلائے گا اور جس پر Super Ego حاوی ہو وہ بھی ابنارمل ہے۔ Ego دونوں کے بیچ سمجھوتا کراتی ہے اور فرد اور اس کے ماحول کے درمیان ایسی مطابقت پیدا کرتی ہے جو مبنی برحقیقت ہو۔

سن کلائن (Klein) کے مطابق جبلت مرگ اور جبلت حیات کے درمیان جب کشمکش ہوتی ہے اور جبلت حیات پر جبلت مرگ غالب آجاتی ہے۔ تو خودکشی اس کا انجام ہوتی ہے۔ کلائن کے مطابق، نارمل انسان وہ ہے جس کی جبلت حیات، جبلت مرگ کو مغلوب کرچکی ہو۔ فرائڈ کہتا ہے کہ موت وحیات کی کشمکش میں جب جبلت مرگ کو شکست ہوتی ہے تو اس کا رخ باہر کی طرف ہوجاتا ہے۔ پھر وہ انعکاس Projection پیدا کرتی ہے۔ جبلت مرگ جب تک نامیہ کے اندر عمل پیرا رہے تو وہ بالکل گونگی اور خاموش ہوتی ہے۔ مگر جب اس کا رخ باہر کی طرف ہوجائے تو اس میں شدت پیدا ہوجاتی ہے۔ اور وہ غصیلی ہوجاتی ہے۔ کلائن اس سے اختلاف کرتے ہوئے کہتی ہے کہ نامیہ کے اندر بھی جبلت مرگ گونگی نہیں ہوتی۔ وہ تخریب ذات کا عمل شروع کردیتی ہے۔ چنانچہ حادثے، بے ہنگم، خودکشی یا طبیعی بیماری یا صحت یاب نہ ہوسکنا وغیرہ اس کا نتیجہ ہوتا ہے۔ کلائن کے نزدیک یہ تخریبی واقعات اس وجہ سے نہیں ہوتے کہ تشدد کا رخ الیغو کی طرف ہوجاتا ہے۔ بلکہ یہ وہ قوت ہے جو نامیہ کے اندر تخریبی عناصر پیدا کرتی رہتی ہے۔

رائخ کہتا ہے کہ موت کی خواہش اس وقت شدید ہوجاتی ہے جب تخیل نفسی کا دوران ختم ہورہا ہو، اس سے پہلے اس میں اتنی شدت نہیں ہوتی۔ فرائڈ کہتا ہے موت اور تولد ایک وقت میں تولید ہوتی ہے۔ وہ جذبات کے دوگونیت یعنی Ambecelence کا بھی قائل ہے۔ کلائن کو بھی اس سے اتفاق ہے۔ ان کے مطابق انسان کے اندر متضاد جبلتیں موجود ہیں۔

معاشرے پر اس کے اثرات اور اس کی ذمہ داری:

خودکشی یا کسی بھی طرح کے جرائم جہاں معاشرے پر اثرات مرتب کرتے ہیں وہیں اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جرائم معاشرے کی دین ہیں۔ اگر معاشرے میں احساس ذمہ داری ہو، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر لوگ عمل پیرا ہوں اور اللہ پر یقین رکھتے ہوں، معاشرہ منصف مزاج ہو تو جرائم میں خاطر خواہ کمی لائی جاسکتی ہے۔ خودکشی سے جو معاشرے پر اثرات مرتب ہوتے ہیں، اس کو سوز سکندر پوری نے ان الفاظ میں کہا ہے:

مانگ کر موت کی میں دعائیں دل ہی دل میں ہوں بے حد پشیماں
میں تو آرام سے سو رہوں گا لوگ مصروف ماتم ملیں گے

خودکشی سے معاشرے پر صرف اخلاقی اثر نہیں پڑتا بلکہ معاشرتی، معاشی اثرات بھی مرتب ہوتے ہیں۔ جہاں ماں باپ بحر یاس وغم میں غوطہ زن ہوجاتے ہیں وہیں بچوں پر یتیمی اور بیوی پر بیوگی سایہ فگن ہوجاتی ہے۔ معاشرے پر ایک معاشی بوجھ پڑ جاتا ہے۔ نفسیاتی طور پر اہل خانہ ٹوٹ جاتے ہیں۔

خودکشی

اِک جنونِ حبِّ ذات

ڈاکٹر خالد محسن

اردو شاعر عبرت صدیقی نے کبھی کہا تھا کہ۔

خودکشی جرم بھی ہے صبر کی توہین بھی ہے
اس لیئے عشق میں مر مر کے جیا جاتا ہے

مصرعہ اولی کا پہلا حصہ کہ خودکشی جرم ہے گو اب جبکہ ہندوستان میں تحفظ ذہنی صحت بل (Mental Health Care Bill) منظور ہو جانے کے سبب غلط ثابت ہو گیا ہے۔لیکن خودکشی کو صبر کی توہین ہمیشہ ہی سمجھا جاتا رہے گا۔

خودکشی عالمی سطح پر انسانی سماج کے لیئے ایک بہت سنگین مسئلہ ہے۔اعداد وشمار کے حوالے سے بات کریں تو عالمی سطح پر ہر چالیس سیکنڈ میں خودکشی کے سبب ایک زندگی ختم ہوتی ہے۔ ۱۵ سے ۳۵ سال کے نوجوانوں کی موت کے اسباب میں خودکشی تیسرے نمبر پر ہے۔ ہندوستان میں سالانہ ایک لاکھ سے زائد افراد خوکشی کرتے ہیں اورخودکشی کے سبب سالانہ ۲ لاکھ خاندان متاثر ہوتے ہیں۔جنگوں اور قتل کی وارداتوں میں مرنے والوں کی جملہ تعداد کے مقابلے میں خودکشی کرنے والوں کی تعداد کئی زیادہ ہے۔خودکشی کا یہ رجحان کسی خاص سماجی طبقے میں نہ ہو کر پورے معاشرے کیلئے وبال جان بنا ہوا ہے۔مرد،خواتین، بوڑھے، بچے، تعلیم یافتہ،غیر تعلیم یافتہ، کسان، پروفیشنلز، شعراء وادباء فنکار اور سیاست داں حضرات، ہر کوئی اقدام خودکشی کا حریص نظر آتا ہے۔مشہور انگریزی میگزین The Week نے ۲۰۰۸ میں کیے گئے سروے میں یہ اعداد وشمار پیش کئے کہ ۲۷ فی صد مصنفین، ۴۲ فیصد فنکار، ۴۱ فیصد سیاست داں اور ۳۶ فیصد مفکر حضرات خودکشی یا اقدام خودکشی کرتے ہیں۔خودکشی کے محرکات مختلف ہیں۔سماجی،نفسیاتی ،اور طبی وجوہات کو خودکشی کے بڑے محرکات تسلیم کیا جاتا ہے۔ بعض نفسیاتی بیماریاں بھی انسان کو خودکشی جیسے سخت اقدام کے لیئے مجبور کر دیتی ہیں تو بعض دفعہ تکلیف دہ جسمانی بیماریاں خودکشی کا سبب بنتی ہیں۔سماجی وجوہات بھی بہت ساری ہیں جس کی وجہ سے خودکشی کی جاتی ہے۔

سماجی وجوہات۔:

اسمائیل درخائیم نے خودکشی کی سماجی وجوہات پر اپنی کتاب میں روشنی ڈالی ہے۔ درخائیم فرانسیسی سماجی مفکر گزرا ہے۔اس کی کتاب Le Suicide میں وہ خودکشی کی درج ذیل وجوہات بتاتا ہے۔

۱۔ Egoistic Suicide (**انا مرکوز خودکشی**)

سماج سے دھتکارے جانے پر کسی فرد میں یہ جذبات پیدا ہوتے ہیں کہ وہ سماج سے ہمیشہ کے لئے کنارہ کشی اختیار کرلے لہذا وہ اقدام خودکشی کرتا ہے۔

۲_Altruistic Suicide (**بے غرض خودکشی**)

کسی معاشرتی مقصد کو حاصل کرنے کیلئے اپنی جان قربان کرنا بھی خودکشی ہے۔جس کی مثال ہندوستان میں ستی کی شکل میں رائج رہی ہے۔

۳_Anomiqui Suicide (**غیر فطری دبائو کے تحت خودکشی**)

زندگی میں اچانک ہونے والی خلاف توقع تبدیلیاں انسان میں بے حد گھٹن پیدا کرتی ہیں۔مثلاً کسی امیر کا اچانک غریب ہو جانا،غیر متوقع ناکامی ہاتھ آنا،کوئی صدمہ لاحق ہو جانا وغیرہ۔ان وجوہات سے ایک شخص میں خودکشی کا رجحان پیدا ہو سکتا ہے۔مشہور شاعر جوش ملیح آبادی نے اس رویہ کو جنون حبّ ذات یا خودغرضی سے تعبیر کیا ہے۔

قابل برداشت جب رہتا نہیں درد حیات
ڈھونڈتی ہے تلملاہٹ زہر میں راہ نجات
اس عمل سے عقل انسانی میں آتی ہے یہ بات
ارتکاب خودکشی تک ہے جنون حبّ ذات

ڈپریشن اور خودکشی:

ڈپریشن ایک نفسیاتی اور طبی مرض ہے جسے خودکشی کی بڑی وجوہات میں شمار کیا جاتا ہے۔عالمی سطح پر ہر پانچ افراد میں سے تیسرا شخص اس بیماری کے لیے ڈاکٹر سے رجوع کرتا ہے۔ WHO نے ڈپریشن کو اکیسویں صدی میں امراض کی فہرست میں پہلے نمبر پر رکھا ہے۔ یونیسکو کے مطابق پوری دنیا میں ۵۰ فی صد بچے تناؤ بھرے ماحول میں پرورش پاتے ہیں جو آگے چل کر ان کے لئے ڈپریشن کا سبب بنتا ہے۔ ہندوستان میں 72% فیصد طلبہ ڈپریشن سے کیسے نمٹا جائے اس سے ناواقف ہیں۔طلبہ میں خودکشی کے بڑھتے رجحان میں اس ناواقفیت کا بھی بڑا دخل ہے۔

نوعمروں میں خودکشی کا رجحان اور اسمارٹ فون:

خودکشی کی بہت ساری وجوہات میں سے دورِ حاضر کی اہم وجہ اسمارٹ فون کا کثرت سے استعمال بھی بن چکا ہے۔ امریکہ کی فلوریڈا اسٹیٹ یونیورسٹی کے محققین نے اپنی تحقیق میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ نوعمروں کے ذریعے موبائیل اسکرین پر گزارا جانے والا وقت ان میں ڈپریشن اور خودکشی کے خطرات کو بڑھادیتا ہے۔ Clinical Psychological Science نامی جرنل میں شائع ایک رپورٹ میں کہا گیا ہے وہ نوجوان جو موبائل یا کمپیوٹر اسکرین سے ہٹ کر کھیل کود، دوستوں سے روبرو ملاقاتوں اور گھریلو کاموں میں زیادہ وقت دیتے ہیں وہ نسبتاً زیادہ خوش رہتے ہیں۔ رپورٹ میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ۴۸ فیصد نوعمر بچے جو پانچ یا اس سے زیادہ گھنٹے الیکٹرانک آلات کا استعمال کرتے ہیں ان میں خودکشی کی ذہنیت محسوس کی گئی ہے۔ پرتشدد مناظر، یاس وقنوطیت اور بلاآخر خودکشی پر ابھارنے والے گیمز بچوں کو نفسیاتی طور پر بہت متاثر کر رہے ہیں۔ بلیو وھیل جیسے گیمز مختلف ناموں سے نوعمروں کو اپنی طرف راغب کر رہے ہیں جسے ایک خطرے کی گھنٹی کے طور پر دیکھا جانا چاہیے۔

خودکشی کی روک تھام کے عالمی سطح پر اقدام:

عالمی ادارہ برائے صحت (WHO) نے یہ تخمینہ لگایا ہے کہ خودکشی کے سبب اموات میں ۲۰۲۰ تک ۱.۵ ملین کا اضافہ ہوسکتا ہے۔ خودکشی صحت عامہ سے متعلق ایسا مسئلہ ہے، جو پوری دنیا میں ہونے والی پرتشدد اموات میں نصف اموات کا سبب ہے اور اربوں ڈالر کے مالی نقصان کا بھی۔ اس خطرناک صورتحال سے نمٹنے کیلئے عالمی سطح پر مختلف اقدامات کئے جارہے ہیں۔ خودکشی کی روک تھام کے لیئے ۱۰ ستمبر کو عالمی سطح پر عالمی یوم برائے خودکشی کے روک تھام کے نام سے منانے کا سلسلہ ۲۰۰۳ سے شروع کیا گیا ہے۔ World suicide Prevention Day کے ذریعے اس بات کو یقینی بنانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ اس سماجی مسئلہ سے متعلق رائے عامہ کو ہموار کیا جائے، اور خودکشی سے روک تھام کے لیئے مختلف سرگرمیاں، پالسیاں اور منصوبے بنا کر سماج سے اس لعنت کو دور کرنے کی کوشش کی جائے۔

اقدام خودکشی کو پوری دنیا میں قانونی جرم تسلیم کیا جاتا رہا ہے۔ لیکن اب عالمی سطح پر اس بات کی کوشش کی جارہی ہے کہ اقدام خودکشی کو جرم کی فہرست سے نکال دیا جائے۔ ہندوستان کے ساتھ تقریباً ۵۸ ممالک نے اس سلسلے میں پیش رفت دکھائی ہے۔

انڈین پینل کوڈ کی دفعہ ۳۰۹ کے تحت اقدام خودکشی کرنے والے شخص کو ایک سال تک جیل میں رکھنے کا قانون تھا۔ لیکن ۸/اگست ۲۰۱۶ کو حکومت ہند نے (Mental Health Care Bill) کو منظوری دے دی ہے۔ لہٰذا اب اقدام خودکشی کرنے والے شخص کو مجرم سمجھنے کی بجائے ذہنی صحت کی بہتری کے لئے علاج ومعالجہ کی سہولت فراہم کی جائے گی۔ مشہور سوشل نیٹ ورکنگ سائٹ فیس بک نے یوزرس میں خودکشی کے رجحان کو سمجھنے کے لئے بعض ایسے انتظامات کیے ہیں کہ جس کی مدد سے خودکشی کے رجحان رکھنے والے افراد کی شناخت کرکے انھیں بروقت مدد فراہم کی جائے گی تاکہ وہ اس اقدام سے محفوظ رہیں۔ فی الوقت یہ تجربات امریکہ وغیرہ میں کیے جاچکے ہیں۔ عالمی سطح پر بھی یہ سہولت پہونچانے کی کوشش کی جاری ہیں۔ یہ تمام تجربات کس حد تک خودکشی کو روک تھام کرپائیں گے یہ تو وقت ہی بتائے گا، کیونکہ یہ کوششیں، وہی قتل بھی کریں ہیں وہی لے ثواب الٹا، کے مصداق ہے۔

اسلامی رہنمائی:

اسلام خودکشی سے تحفظ کے لیے زبردست رہنمائی کرتا ہے سب سے پہلے تو یہ بات اہم ہے کہ ایک شخص مسلمان ہو اور وہ خودکشی کا رجحان بھی رکھے ایسا نہیں ہوسکتا۔ مسلم معاشرہ میں یہ وبا بہت کم ہے۔ کیونکہ اسلام نے انسانی زندگی کے مقصد کو اپنے ماننے والوں پر واضح رکھا ہے۔ قرآن اور سنت کی درج ذیل تعلیمات معاشرے کو خودکشی کی لعنت سے چھٹکارا دلاسکتی ہیں۔

۱) قرآن موت وحیات کو پیدا کرنے کا مقصد واضح کرتا ہے اس کے ذریعے اچھے اعمال کرنے والوں کو پرکھنا مقصود ہے۔ زندگی اللہ کی عطا کردہ نعمت ہے جسے ایک مقصد کے تحت گزارنے کا پروگرام بھی اسلام نے دیا ہے۔

۲) صبر کو بہترین اجر کا ذریعہ بتایا گیا ہے۔ اہل ایمان کی خصوصیات میں عبادت سے پہلے صبر کو پیش کیا گیا ہے۔ دنیا میں بےصبرے لوگ ہی خودکشی کرتے ہیں۔

۳) خودکشی کرنے والے افراد مایوسی کے سبب خودکشی کرتے ہیں۔ لیکن اسلام نے مایوسی

نیشنل کرائم ریکارڈس بیورو (NCRB) کے مطابق طلباء میں خودکشی کے اعداد و شمار
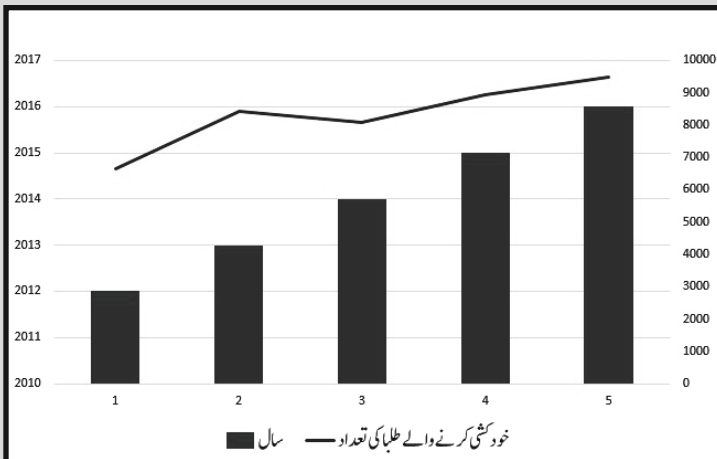
سال	خودکشی کرنے والے طلبا کی تعداد
2012	6654
2013	8423
2014	8068
2015	8934
2016	9474

اسلام شہادت کی موت کو سعادت کی موت قرار دیتا ہے۔ اسلام نے صرف زندگی گزارنے کے طریقے ہی نہیں بتائے بلکہ مثالی موت کے سلیقے بھی سکھائے ہیں۔ انسان اگر خود غرض بن کر خودکشی کرے تو ہلاک لیکن اللہ کے پسندیدہ راستے پر چل کر مرے تو شہید کا درجہ پاتا ہے۔

کو کفر قرار دیا ہے۔

۴) اچھی اور بری تقدیر کا اللہ کی طرف سے ہونے کا عقیدہ انسان کو متوازن سوچ کا حامل بناتا ہے۔

۵) پریشان دلوں کو اطمینان بخشنے کا بہترین طریقہ جو قرآن بتاتا ہے وہ ذکر اللہ ہے۔ الا بذکر اللہ تطمئن القلوب بے شک اللہ کے ذکر سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوتا ہے۔ (القرآن)

۶) خودکشی کرنے والوں سے متعلق احادیث رسولؐ میں سخت وعیدیں آئیں ہیں جس کے تصور سے ہی انسان خودکشی کے خیال سے بعض آجاتا ہے کیونکہ خودکشی کرنے والا اپنی جان کو ہلاک کر کے غموں سے چھٹکارا نہیں پاتا بلکہ مرنے کے بعد مزید عذاب کا مستحق قرار پاتا ہے۔

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مرجائیں گے
مرکے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

۷) صالح صحبت: اللہ کے رسول نے صالح صحبت کی اہمیت کو اہل ایمان پر واضح کیا ہے۔ خودکشی کی کئی وجوہات میں سے ایک وجہ تنہائی بھی ہے۔ انسان اگر غلط صحبت اختیار کرلے تب بھی مشکل اور تنہا رہے تب بھی خسارا لہذ اصالح صحبت کو اختیار کرنے والے زندگی کے حقیقی لطف سے سرشار ہوتے ہیں۔ موجودہ دور میں اسلامی اجتماعیت سے وابستگی نوجوانوں کے لیے ایک بہترین صالح صحبت اختیار کرنے کا پلیٹ فارم ہے۔ جہاں ایک دوسرے سے اللہ کے لئے محبت کرنے والے احباب میسر آتے ہیں جو زندگی کا بہترین سہارا بھی ثابت ہوتے ہیں اور اگر کسی ساتھی پر قنوطیت طاری ہوتی ہے تو وہ فوری پکار اٹھتا ہے کہ

خودکشی چپکے سے کرنے نہیں دیتے مجھ کو
چند چہرے ہیں جو مرنے نہیں دیتے مجھ کو

۸) اسلام شہادت کی موت کو سعادت کی موت قرار دیتا ہے۔ اسلام نے صرف زندگی گزارنے کے طریقے ہی نہیں بتائے بلکہ مثالی موت کے سلیقے بھی سکھائے ہیں۔ انسان اگر خودغرض بن کر خودکشی کرے تو ہلاک لیکن اللہ کے پسندیدہ راستے پر چل کر مرے تو شہید کا درجہ پاتا ہے۔

۹) اللہ کے رسولؐ نے دعا کو مومن کا ہتھیار قرار دیا ہے۔ ایسی دعائیں سکھائیں جو ڈپریشن، یاس وقنوطیت، عجز وکاہلی جیسے رویوں سے اللہ کی پناہ میں آنے کا حوصلہ فراہم کرتی ہیں۔ اسلام کا یہ ماڈل اگر عام کیا جائے تو یہ بات دعوے سے کہی جاسکتی ہے کہ سماج سے خودکشی کا خاتمہ ہوسکتا ہے۔

یہ مسئلہ آپ کا نہیں:

قارئین رفیق منزل جس صالح اجتماعیت کا کسی نہ کسی شکل میں حصہ ہیں ان کی صفوں میں یہ مسئلہ قطعی نہیں ہے۔ لیکن ہم جس سماج میں رہتے اور بستے ہیں وہاں اکثر ایسے افراد مل جاتے ہیں جو زندگی سے پریشان ہیں اور چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی مدد اور رہنمائی کرنا ہمارا فرض ہے۔ اس مضمون کے مخاطب آپ ان معنوں میں ہیں کہ آپ کو سماج میں پائی جانے والی اس بیماری کی روک تھام کے لیے اٹھ کھڑا ہونا چاہئے۔ انسانی جانوں کا تحفظ ہمارا دینی فریضہ ہے۔ اس میدان میں مختلف تنظیمیں سرگرم ہیں جو خودکشی سے لوگوں کو بعض رکھنے کے لئے بہترین کوششیں کررہی ہیں۔ افسوس کہ امت مسلمہ اس میدان میں کہیں نظر نہیں آتی۔ ذیل میں کچھ ایسی تنظیموں اور ہلیپ لائن سینٹرز کی معلومات پیش کی جارہی ہے جو خودکشی کی روک تھام کے لیئے کوشش کررہی ہیں۔ ہمیں چاہیئے کہ ان کے کاموں کو سراہیں۔ ان کا تعاون کریں اور ممکن ہو تو ہم بھی اس طرح کی عملی کوششوں کا آغاز کریں۔

۱) AASRA:

ممبئی میں ۱۹۹۸ سے پبلک چیریٹی ایکٹ کے تحت رجسٹر، یہ ادارہ زندگی سے مایوس لوگوں کو آن لائن، آف لائن، بذریعہ فون اور راست ملاقات کے ذریعے پرامید زندگی جینے میں مدد فراہم کرتا ہے۔ اس ادارہ کے ضمن میں مزید معلومات اس ویب سائٹ سے حاصل کی جاسکتی ہے۔ www.aasra.info

۲) Suicide.org:

یہ ایک غیر منافع بخش تنظیم اور ویب سائٹ ہے۔ جس کا مقصد خودکشی کی روک تھام، بیداری اور خودکشی کا رجحان رکھنے والوں کو اس کیفیت سے باہر نکلنے کے لئے مدد کرنا ہے۔ خودکشی سے متعلق ہر طرح کی معلومات کا ذخیرہ اس ویب سائٹ پر موجود ہے۔ www.suicide.org

۳) SNEHA:

چینئی میں واقع یہ ادارہ ڈپریشن سے متاثر اور زندگی سے ناامید لوگوں کو جذباتی تعاون فراہم کرتا ہے۔ ویب سائٹ، ٹیلی فون اور راست ملاقات کر کے کونسلنگ کی خدمات یہ ادارہ فراہم کرتا ہے۔ www.snehaindia.org

ان کے علاوہ اور کئی ادارے اور ویب سائٹس ہیں جو کونسلنگ بھی کرتی ہیں اور رضا کارانہ طور پر کام کرنے کا جذبہ رکھنے والے کونسلرز کو بھی تیار کرتی ہیں۔ درج ذیل ویب سائٹس پر آپ مزید رہنمائی حاصل کرسکتے ہیں اور ضرورت مندوں تک پہونچا سکتے ہیں۔

www.befriendersindia.org

www.education.vsnl.com

www.mumbainet.com

www.sumaitri.org

www.maithrikochi.com

گلزار صحرائی

طلبہ میں خودکشی کا بڑھتا رجحان

اسباب اور ہماری ذمہ داریاں

زندگی کے بارے میں حضرت انسان بہت تلوّن مزاج واقع ہوا ہے۔ کبھی تو اسے یہ زندگی اتنی عزیز ہوتی ہے کہ اس کے فانی ہونے کی حقیقت سے واقف ہوتے ہوئے بھی وہ اسے زیادہ سے زیادہ پرلطف انداز میں گزارنے کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار ہو جاتا ہے، بلکہ بسا اوقات وہ مرتبۂ انسانیت سے بھی گر جاتا ہے اور کبھی وہ اس سے اتنا بے زار اور دل برداشتہ ہو جاتا ہے کہ خود اپنے ہاتھوں اپنی زندگی کا خاتمہ کرنے میں بھی اسے تأمل نہیں ہوتا۔ انسانی مزاج کے اس تلوّن کا اثر یوں تو ہر طبقے اور ہر عمر کے لوگوں میں پایا جاتا ہے لیکن نوجوان نسل، خصوصاً طلبہ میں اس کا کچھ زیادہ ہی اثر دیکھنے میں آتا ہے۔

کسی بھی قوم کا سب سے قیمتی سرمایہ اس کی نوجوان نسل ہوتی ہے، کیوں کہ اسی نوجوان نسل پر اس کے مستقبل کا دارومدار ہوتا ہے، اسی سے اس کی امیدیں وابستہ ہوتی ہیں۔ اگر یہی نوجوان نسل یاس وقنوط کا شکار ہوکر حوصلہ ہار بیٹھے، مسائل کا بہادری اور حوصلہ مندی سے سامنا کرنے اور انھیں حکمت ودانش سے حل کرنے کے بجائے راہِ فرار اختیار کرنے لگے، حتیٰ کہ یاسیت کی اس انتہا کو پہنچ جائے کہ اپنے ہی ہاتھوں اپنی زندگی کو ختم کرنے کا رجحان اس میں پنپنے لگے تو یہ کسی بھی قوم کے لیے انتہائی تشویش کی بات ہے۔

ہم آئے دن اخبارات میں اس طرح کی خبریں پڑھتے ہیں کہ فلاں طالب علم یا طالبہ نے امتحان میں ناکام ہونے، یا مطلوبہ پوزیشن حاصل نہ کر پانے کے سبب خودکشی کر لی۔ میڈیا کے مطابق ہندستان میں ہر گھنٹے میں ایک طالب علم خودکشی کر لیتا ہے، اعداد وشمار یہ بتاتے ہیں کہ بھارت میں 2015ء کے دوران 8934 طلبہ نے خودکشی کی۔ اسی طرح 2011ء سے 2015ء کے دوران 39775 طلبہ نے اپنی زندگی کا خود خاتمہ کیا۔ ایک ادارے لینسٹ کی 2012ء کی رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ گزشتہ 15 سال سے ہندستان میں 29 سال تک کے نوجوانوں میں خودکشی کا رجحان دنیا بھر میں سب سے زیادہ ہے۔ یہ اس وقت ہے جب کہ ہندستان کو نوجوانوں کی طاقت کا ملک کہا جاتا ہے اور یہاں کی تقریباً دوتہائی آبادی 35 سال سے کم عمر کے افراد پر مشتمل ہے۔ آبادی میں جوانوں کا یہ تناسب یقینا خوش کن ہونا چاہیے لیکن اس نوجوان طبقے میں یاس وقنوط اور خودکشی کا بڑھتا رجحان اس خوش فہمی کو کم کر دیتا ہے۔

نئی نسل میں یہ مایوسی کیوں؟: سوال یہ ہے کہ نئی نسل میں اس رجحان کے پنپنے کی وجہ کیا ہے؟ اس کا جواب تلاش کرنے کے لیے ہمیں انسانی نفسیات کو سمجھنا ہوگا، خصوصاً آج کے دور کے انسان کی نفسیات کو۔ ہم جانتے ہیں کہ آج کا دور پوری طرح مادہ پرستی کا دور ہے۔ آج کے انسان کے پیشِ نظر صرف اور صرف اسی دنیا کی رنگینیاں ہیں، جن سے وہ ہر حال میں لطف اندوز ہونا چاہتا ہے۔ اس سے آگے سوچنے کے لیے نہ اس کے پاس وقت ہے نہ وہ اس کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ مذہبی اقدار اور خدا کے سامنے جواب دہی کا تصور تقریباً مدھم پڑ چکا ہے۔ اگر کہیں مذہب کا تصور ہے بھی تو وہ صرف انسان کی ذاتی زندگی تک محدود کر دیا گیا ہے۔ یعنی مذہب کا انسانی زندگی میں صرف یہ کردار ہے کہ انسان کچھ مذہبی رسوم کی پابندی کر لے، اور ایسا بھی شعوری طور پر نہیں کیا جاتا، بلکہ یہ بھی اس فطری جذبے کے تحت ہوتا ہے جو اسے کسی نہ کسی غیبی طاقت کے آگے سر جھکانے پر مجبور کرتا ہے، خواہ وہ زبان سے اس کا کتنا ہی انکار کرے۔ ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ مذہب اور خدا کے سامنے جواب دہی کا تصور انسان کی عملی زندگی سے تقریباً خارج ہو چکا ہے۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں اس فانی دنیا کی چندروزہ زندگی انسان کے لیے انتہائی قیمتی قرار پانا ایک قدرتی امر ہے۔ ایسے میں لازم ہوجاتا ہے کہ جتنی جلدی اور جتنا زیادہ ممکن ہو اس فانی زندگی کی آسائشیں سمیٹ لی جائیں، کیوں کہ کون جانتا ہے کہ کب موت کا وقت قریب آجائے اور تمام مطلوبہ خواہشیں اور تمنائیں پوری ہونے سے رہ جائیں۔ لہٰذا عقل مندی اسی میں ہے کہ جیسے بھی ہو اس فانی دنیا کے زیادہ سے زیادہ مزے لوٹ لیے جائیں۔ مرنے کے بعد کا حال کون جانتا ہے۔ بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

اس خالص دنیوی اور مادہ پرستانہ طرزِ فکر نے انسانی زندگی کے ہر شعبے اور ہر طبقے کو متاثر کیا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب تدریس کے پیشے کو ایک سماجی خدمت کا رتبہ حاصل تھا اور استاد اور شاگرد کا رشتہ انتہائی مقدس رشتہ مانا جاتا تھا۔ مگر مادہ پرستی کے کلچر نے تمام شعبہ ہائے زندگی سے اخلاقیات کا جنازہ نکالنے کے ساتھ ساتھ استاد اور شاگرد کے رشتے کو بھی محض ایک کاروباری تعلق بنا کر رکھ دیا ہے۔ اب جہاں اساتذہ کے لیے یہ صرف حصول زر کا ایک ذریعہ رہ گیا ہے، وہیں طالب علم کے لیے بھی حصول علم کا اگر کوئی مقصد ہے تو وہ بس بہتر سے بہتر ملازمت یا روزگار کا حصول ہے۔

تعلیمی اداروں میں مسابقت اور 100 فی صد نمبرات کے حصول کا ہدف: اسی طرزِ فکر نے دیگر شعبہ ہائے حیات کی طرح اس شعبے میں بھی مسابقت اور تکاثر کو جنم دیا۔ مسابقت فی نفسہ کوئی بری چیز نہیں، بلکہ بعض اوقات وہ ضروری ہوتی ہے، اور اس کے بغیر ترقی کا تصور ممکن نہیں، لیکن جب مسابقت اپنی انتہا پر پہنچ جائے اور تکاثر کی شکل اختیار کر لے تو یہ انتہائی خطرناک ہو جاتی ہے۔ آج تعلیمی اداروں میں اس مسابقت نے جو شکل اختیار کر لی ہے وہ سب پر عیاں ہے۔ تعلیمی اداروں کو بچوں کے مستقبل سے زیادہ اپنی ساکھ کی فکر رہتی ہے۔ اور ہر ادارہ چاہتا ہے کہ اس کا تعلیمی ریکارڈ دوسروں سے بہتر رہے۔ ظاہر ہے اس کا پریشر شعوری یا غیر شعوری طور پر طلبہ ہی کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔

ایک زمانہ تھا جب 60 فی صد نمبر لانے والے طلبہ کو فرسٹ ڈویژن کی کٹیگری میں رکھا جاتا تھا اور باعث اطمینان تصور کیا جاتا تھا۔ اس سے زیادہ نمبر لانے والوں کو تو فرسٹ، سیکنڈ اور تھرڈ پوزیشن کا مستحق قرار دیا جاتا تھا۔ مگر اب 60۔70 فی صد کا تو ذکر ہی کیا، 90۔95 فی صد نمبر بھی قابل اطمینان تصور نہیں کیے جاتے، بلکہ طلبہ کے سامنے 100 فی صد کا ہدف ہوتا ہے، جس کا حصول کوئی آسان کام نہیں۔ ظاہر ہے اس ہدف کو محض ایک دو فی صد طلبہ ہی حاصل کر سکتے ہیں۔ دیگر طلبہ لاکھ کوششوں کے بعد بھی اس مطلوبہ معیار کو حاصل نہیں کر پاتے۔ اور یہیں سے مایوسی کا آغاز ہوتا ہے۔ کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ حصول تعلیم کے بعد مارکیٹ میں بھی ان ہی طلبہ کی مانگ ہوتی ہے جو 100 فی صد یا 98۔99 فی صد سے کامیاب قرار پائے ہوتے ہیں۔ دیگر طلبہ لاکھ کوششوں کے باوجود 'فالتو' کے زمرے میں آجاتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ 'فالتو' کہلانا کوئی پسند نہیں کرتا۔

والدین کی طرف سے ذہنی دباؤ کا سامنا: بات یہیں تک محدود ہوتی تو بھی سہا جا سکتا تھا۔ جیسا کہ ابتداء میں عرض کیا گیا کہ مادہ پرستی پر مرکوز طرزِ فکر سے ہر طبقہ متاثر ہوا ہے، تو والدین اس سے کیسے اچھوتے رہ سکتے ہیں۔ فی زمانہ والدین کے نزدیک اولاد کی تعلیم کا مقصد وحید بھی اس کے سوا کچھ نہیں رہ گیا ہے کہ اولاد جلد سے پڑھ لکھ کر

کمانے کی مشین بن جائے۔ اس طرزِ فکر نے والدین کو حد درجہ خود غرض بنا دیا ہے، جن کے لیے اولاد کا وجود ایک درخت سے زیادہ نہیں ہے، جسے کھاد پانی دے کر محض اس لیے بڑا کیا جاتا ہے کہ آگے چل کر وہ محض سایہ ہی نہیں، بلکہ رسیلے پھل بھی دے سکے۔ اب اگر وہ درخت بے ثمر ثابت ہو تو یہ انتہائی مایوسی کی بات ہوگی۔ چنانچہ والدین کی جانب سے بچوں پر انتہائی پریشر ڈالا جاتا ہے کہ انہیں ہر حال میں مطلوبہ ہدف پورا کرنا ہے۔ اس کے برخلاف نتیجہ آنے پر انھیں اپنی امنگوں اور خواہشوں پر پانی پھرتا محسوس ہوتا ہے، اور ردِ عمل میں اس اولاد کو سخت وسست اور حوصلہ شکن کلمات سننے کو ملتے ہیں، جو پہلے ہی تمام کوشش کے باوجود مطلوبہ ہدف حاصل نہ کر پانے کا کرب برداشت کر رہی ہوتی ہے۔ ایسے میں اگر اسے اس قسم کے نازیبا کلمات سننے کو ملیں— ''کیا فائدہ ہوا اتنا پیسہ برباد کرنے سے؟''، ''اتنے کم نمبروں پر بھلا کہاں ایڈمیشن ہوگا؟''، ''پڑھ لکھ کر بھی نوکری پانے کے قابل نہ ہو سکے تو تعلیم دلانے کا کیا فائدہ؟''— تو یاس وقنوط کا طاری ہونا فطری بات ہے۔

ایک تو مسابقت سے بھری دنیا کا ٹینشن ہی کیا کم تھا، اس پر ان والدین اور قریبی عزیزوں کی طرف سے، جن کا کام ایسے وقت میں حوصلہ دینے اور ہمت بندھانے کا تھا، حوصلہ شکن کلمات سن کر بھلا کون دل برداشتہ نہ ہوگا۔ اور پھر نوجوانی کا دور تو ویسے بھی بہت نازک اور حساس دور ہوتا ہے۔ اس عمر میں مزاج کا تلون بھی پورے شباب پر ہوتا ہے، کچھ کر گزرنے کی چاہ اور آسمان پر کمندیں ڈالنے کی خواہش جتنی تیزی سے پروان چڑھتی ہے، نامساعد اور دل شکستہ حالات میں مایوسی بھی اتنی ہی تیزی سے حملہ آور ہوتی ہے۔ ایسے میں اگر جذباتی طور پر کوئی سہارا نہ ملے، بلکہ اس کی جگہ طعنے تشنے اور حوصلہ شکن باتیں ہی سننے کو ملیں تو یہ مایوسی اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے، جس کا نتیجہ بسا اوقات خودکشی کی شکل میں سامنے آتا ہے۔

موجودہ طرزِ فکر کی اصلاح: سب سے پہلے تو یہ طرزِ فکر بدلنی چاہیے کہ تعلیم کا واحد مقصد محض روزگار، خصوصاً نوکری کا حصول ہے۔ ظاہر ہے کہ کالجوں، یونیورسٹیوں کی سیٹیں بھی محدود ہوتی ہیں، اور نوکریاں بھی خواہ کتنی ہی ہوں، بہر حال سب کے لیے کفایت نہیں کر سکتیں، اس لیے بہت سے طلبہ کو اس سلسلے میں بہر حال مایوسی کا سامنا کرنا ہی پڑے گا۔ تو کیوں نہ پہلے سے ہی اس کے لیے تیار رہا جائے۔

یہاں والدین اور طلبہ دونوں کو یہ بات ملحوظ رکھنی چاہیے کہ علم حاصل کرنا بہر حال ضروری ہے، خواہ ملازمت کرنا مقصود ہو یا نہ ہو، پھر یہ کہ علم کبھی رائگاں نہیں جاتا۔ اہلِ علم اپنی قدر منوا کر رہتا ہے، بس سچی لگن اور حوصلے کی ضرورت ہے۔ زندگی کے بہت سے شعبے ایسے ہیں جہاں محض نامور تعلیمی اداروں کی ڈگریاں کام نہیں آتیں، بلکہ وہاں اصل امتحان قابلیت اور صلاحیت کا ہوتا ہے۔ خود روزگار اور ذاتی کاروبار میں ظاہر ہے صلاحیت اور قابلیت ہی کی اہمیت ہوتی ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ اسکول کالج میں کم تر پوزیشن سے کامیاب ہونے والے طلبہ بھی اپنی ذہانت اور صلاحیت سے کاروباری دنیا میں انتہائی کامیاب ثابت ہوئے ہیں۔

لہٰذا دورانِ تعلیم اپنی پسند کی ملازمت کا خواب ضرور دیکھیں، لیکن اسے واحد اور آخری ہدف (Goal) ہرگز نہ بننے دیں، بلکہ مختلف آپشنز (Options) ضرور ذہن میں رکھیں۔ یاد رکھیں، زندگی صرف ایک خواہش نہیں کہ وہ پوری نہ ہوئی تو اسے ختم کر لیا جائے، بلکہ ایک راستہ بند ہو تو دوسرے کئی راستے ہمارے سامنے کھلے ہوتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اپنے مقصد کو لے کر ہم اتنے خود مرتکز ہو جاتے ہیں کہ ہمیں اس کے سوا آس پاس کچھ نظر نہیں آتا۔

زندگی کے بارے میں صحیح طرزِ فکر: اس سلسلے میں اسلامی تعلیمات بہت مددگار اور حوصلہ افزا ثابت ہوتی ہیں۔ اسلام کی رو سے یہ دنیا دارالجزا نہیں، بلکہ دارالعمل ہے، اور اصل دارالجزا اخروی زندگی ہے۔ اسلام کے نزدیک اس فانی دنیا کی عارضی کامیابی یا ناکامی بہت زیادہ اہمیت نہیں رکھتی، بلکہ اس کے نزدیک اصل کامیابی یا ناکامی اخروی زندگی میں ملنے والی کامیابی یا ناکامی ہے۔ بے شک اسلام انسان کو سعی و جہد پر ابھارتا ہے، لیکن ساتھ ہی وہ یہ حوصلہ بخش اصول بھی دیتا ہے:

''اور انسان کے لیے وہی کچھ ہے جس کے لیے اس نے کوشش کی۔'' (سورۃ النجم:۳۹)

یعنی خدا کے نزدیک اصل اہمیت انسان کی صحیح سمت میں کی جانے والی سعی وجہد ہے۔ اگر کوئی سعی وجہد کا حق ادا کر دیتا ہے تو خدا کی نظر میں وہ کامیاب ہوگا، خواہ دنیوی حیثیت میں وہ کیسا ہی ناکام کیوں نہ ثابت ہوا ہو۔ یہ حکم صرف آخرت کے لیے کیے گئے اعمال پر ہی چسپاں نہیں ہوتا، بلکہ دنیوی معاملات میں بھی، ہم دیکھیں تو ہمیں اس سے بڑی رہنمائی ملتی ہے۔

کوئی طالب علم اس کے سوا بھلا اور کر بھی کیا سکتا ہے کہ پوری محنت اور لگن سے پڑھائی کرے، اس کے باوجود اگر کسی وجہ سے وہ امتحان میں کسی اور کے مقابلے کم نمبر حاصل کر پاتا ہے تو بھلا اس میں اس کا کیا قصور ہے؟ کیوں کہ سعی وجہد کا حق تو اس نے ادا کیا ہی۔ پھر محض اس وجہ سے کہ وہ کسی اور سے پیچھے رہ گیا، اس کی سعی وجہد کی قدر کرنے کے بجائے اسے موردِ الزام کیوں ٹھہرایا جائے؟ اور وہ خود بھی اپنے آپ کو قصوروار کیوں سمجھے؟ ظاہر ہے اپنی مرضی کے مطابق نتیجہ پانا تو اس کے دائرۂ اختیار میں نہیں تھا، پھر اس کے لیے اس کو لعنت وملامت کیوں کی جائے؟

والدین کی ذمہ داری مادہ پرستانہ طرزِ فکر سے متاثر موجودہ مسابقتی کلچر کو بدلنا بھلے ہی کوئی آسان کام نہ ہو، لیکن والدین اپنا طرزِ فکر تو تبدیل کر ہی سکتے ہیں۔ والدین کو چاہیے کہ اپنے بچوں سے امیدیں ضرور لگائیں، لیکن نہ تو ان امیدوں کے پورا نہ ہونے پر انھیں بلاوجہ موردِ الزام ٹھہرائیں، نہ ان پر اپنی مرضی مسلط کرنے کی کوشش کریں۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ بچوں کا رجحان کچھ اور ہوتا ہے اور والدین انھیں کچھ اور بنانا چاہتے ہیں، اس کا بھی بچوں کی تعلیم پر برا اثر پڑتا ہے اور بسا اوقات ذہین طالب علم، اپنی مرضی کے خلاف اختیار کیے گئے مضمون کی وجہ سے تعلیم پر وہ توجہ نہیں دے پاتا جو مطلوب ہوتی ہے اور اس وجہ سے بھی وہ تعلیم میں پچھڑ جاتا ہے۔ اس پر ستم ظریفی یہ ہوتی ہے کہ بجائے اس کے کہ والدین اولاد کے اس جذبۂ فرماں برداری کی قدر کریں، اور اس کا حوصلہ بڑھائیں، الٹے اسے لعنت ملامت کرنے لگتے ہیں کہ اس نے ان کی امنگوں پر پانی پھیر دیا۔

اولاد کے سلسلے میں ماں باپ کا نہ تو یہ رویہ درست ہے کہ انھیں محض اپنی جائداد سمجھیں اور ہر حال میں اپنی مرضی کا پابند بنائیں، نہ یہ درست ہوگا کہ انھیں اس معاملے میں بالکل آزاد چھوڑ دیا جائے کہ وہ اپنا کیریئر جس لائن میں بھی بنانا چاہتے ہوں، بنائیں۔ کیوں کہ علمِ غیر نافع اور مذہبی اعتبار سے ناجائز نیز مخربِ اخلاق پیشوں کی طرف جانے سے اولاد کو بچانا بھی بہر حال ان ہی کی ذمہ داری ہے۔ اس لیے اگر بچوں کا رجحان کسی ایسے پیشے کی طرف ہو تو اس سے انھیں ضرور روکیں، لیکن محض اپنی امنگوں اور آرزوؤں کی خاطر ان کے جذبات ورجحانات کا خون ہرگز نہ کریں۔ اگر والدین بچوں کو اپنی امنگوں کا دشمن مان کر ان کو لعنت ملامت کرنے کے بجائے، ان کے دوست بن کر ان کے مسائل کو سمجھیں، ان کے جذبات واحساسات کی قدر کریں، تو کوئی وجہ نہیں کہ کوئی طالب علم، امتحان میں ناکام ہونے یا مطلوبہ ہدف پورا نہ کر پانے پر، خود کو تنہا محسوس کر کے خودکشی کی طرف راغب ہوں۔

خودکشی

مسائل اور حل

قرآن وحدیث کی روشنی میں

سراج کریم سلفی، علی گڑھ

موجودہ دور ترقی یافتہ دور ہے۔ آرام وآسائش اور ذہنی وجسمانی تفریح کے لیے ان گنت وسائل کی فراوانی ہے۔ وسائل وسہولیات کے بہتات کے باوجود انسانی زندگی حقیقی چین وسکون اور قلبی اطمینان سے محروم ہے۔ بے اطمینانی، بے چینی اور بے سکونی اور دیگر دنیاوی الجھنوں کی وجہ سے انسانیت مضمحل ہوگئی ہے۔ سماج ومعاشرے میں برائیوں اور جرائم کا سیلاب ہے، انہیں بڑھتے ہوئے خوفناک جرائم میں سے ایک خودکشی ہے۔

ہر انسان کو سب سے زیادہ عزیز اس کی زندگی ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے ''جب تک جان ہے جہان ہے''، لیکن لوگوں کی ایک لمبی قطار ہے جو سانس لینے کے باوجود حقیقی معنوں میں مردہ ہیں، جو گردش حالات کے تھپیڑوں سے گھبرا کر اپنے اعزاء واقارب سے منہ پھیر کر ایسی جگہ جانا چاہتے ہیں جہاں سے واپسی کا راستہ مسدود ہے، جسے خودکشی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

گذشتہ کچھ سالوں میں ڈرامائی طور پر خودکشی کا رجحان بڑھا ہے۔ ادنیٰ اور معمولی وجوہات کی بنا پر بھی اپنی عزیز جان کو ختم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہ ایسا مسئلہ ہے جس پر بات کرنے سے لوگ کتراتے ہیں، گذشتہ سالوں سے کچھ تحریکیں اس کے متعلق متحرک ہوئی ہیں۔ 1990 میں اقوام متحدہ کی طرف سے پہلی مرتبہ خودکشی سے بچاؤ کونسل پالیسی کو منظوری دی گئی۔ 10/ دسمبر 2003 کو پہلی بار خودکشی سے بچاؤ کا عالمی دن قرار دیا گیا، 2011 میں 40 ممالک میں اس دن کو سرکاری سطح پر منایا گیا۔

عالمی صورت حال

دنیا میں خودکشی کے رونما ہونے والے واقعات کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ عالمی ادارۂ صحت WHO (ورلڈ ہیلتھ اورگانائزیشن) کی رپورٹ کے مطابق ہر سال آٹھ لاکھ تک خودکشیاں ہوتی ہیں۔ یعنی ہر چالیس سکینڈ میں ایک آدمی خودکشی کرکے اپنی جان لیتا ہے۔ دنیا میں کل اموات میں خودکشی کی وجہ سے ہونے والی اموات کی شرح ایک اعشاریہ آٹھ فیصد ہے۔ ایک سروے کے مطابق دنیا میں ہر تین سکینڈ میں خودکشی کی کوشش کی جاتی ہے۔ ان میں سے ہر بیس میں سے ایک آدمی خودکشی کرنے میں کامیاب ہوتا ہے اور انیس ناکام ہوتے ہیں۔ 15 سے 29 سال کی عمر کے نوجوانوں میں خودکشی کا رجحان زیادہ پایا جاتا ہے، یہ نوجوانوں کی اموات کی دوسری سب سے بڑی وجہ ہے۔ ستر سے زیادہ عمر کے لوگوں میں بھی خودکشی کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔

عالمی سطح پر اگر خودکشی کے واقعات کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یورپین ممالک اور یونین یورپین اس میں آگے ہیں جہاں سیکولر نظام قائم ہے جہاں ہر قسم کی مذہبی وشخصی آزادی ہے۔ جو ممالک غربت وافلاس سے دوچار نہیں ہیں بلکہ خوشحال ہیں۔ سر فہرست ممالک میں ساؤتھ کوریا، گیانا، لیتھونیا، سری لنکا وغیرہ ہیں۔

ہندوستان کی صورت حال

ترقی کے دعویدار ہمارا ملک ہندوستان میں گذشتہ چند سالوں میں حیرت انگیز طور پر خودکشی کے واقعات میں اضافہ ہوا ہے۔ عالمی ادارۂ صحت (ورلڈ ہیلتھ اورگانائزیشن) کی تیارہ کردہ رپورٹ کے مطابق ہندوستان سرفہرست ممالک میں 12 ویں نمبر پر ہے۔ NCRB (نیشنل کرائم ریکارڈ بیورو) کے مطابق 2011 میں 135585، 2012 میں 135445، 2013 میں 134799، 2014 میں 131661، 2015 میں 133623 لوگوں نے خودکشی کرکے اپنی جان لی۔ 2011 کے بعد اس میں کچھ کمی آئی لیکن 2015 میں پھر اضافہ ہوگیا یہ 2015 تک کی رپورٹ ہے اس کے بعد خصوصا کسانوں، فوجوں اور طالب علموں میں اس کے رجحان میں کافی اضافہ ہوا ہے۔ اعداد وشمار کے مطابق ہر آٹھ گھنٹے میں ایک کسان اپنے ہاتھوں موت کا جام پی کر داغ مفارقت دے جاتا ہے۔ ہندوستان میں کسانوں کی تنظیم ''ودار بہ جن آندولن سمیتی'' (وی، جے، اے، ایس) کے مطابق صرف مہاراشٹرا میں 2013 سے

اب تک 2900 کسانوں نے خودکشی کی۔ کسانوں کی خودکشی کے معاملے میں کرناٹک، تامل ناڈو، مہاراشٹرا، آندھرا پردیش اور چھتیس گڑھ وغیرہ اضلاع سرفہرست ہیں۔ فوجوں میں بھی اس کا رجحان کافی تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ ایک رپورٹ کے مطابق تینوں مسلح افواج میں ہر تین دن میں ایک فوجی خودکشی کرتا ہے۔ اسی طرح طالب علموں اور دیگر طبقات میں حیرت انگیز طور پر خودکشی کا رجحان بڑھا ہے۔

وسائل آسائش وآرام کی فراہمی کے باوجود لوگوں کے درمیان خودکشی کے اس بڑھتے رجحان کے پیچھے کیا عوامل واسباب ہیں، کیوں ایک آدمی اپنی عزیز جان کا دشمن بن کر اپنے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتر کر اعزاء واقارب کو غم واندوہ میں چھوڑ جاتا ہے اور ان کے لیے معاشرے میں بدنامی کا سبب بن جاتا ہے۔ حد تو یہ کہ ہر عمر کے افراد اس میں ملوث نظر آتے ہیں۔ درج ذیل سطور میں چند عوامل واسباب کی طرف مختصراً اشارہ کیا جاتا ہے۔

سماجی مسائل

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ خودکشی کی سب سے بڑی اور اہم وجہ سماجی مسائل وعوامل ہیں۔ معاشرے اور سماج میں روز افزوں خاندانی جھگڑے (اولاد والدین، میاں بیوی، ساس بہو، بھابھی نند، بھائی بھائی کے درمیان جھگڑے) اہل حقوق کے حق کی پامالی، معاشرے میں پھیلی منافرت، بدامنی، ظلم وتشدد، قتل وغارت گری وفتنہ فساد کے بڑھتے واقعات، حکومتوں وسرکاری اداروں میں ناانصافی، عوام کے ساتھ ان کا رویہ، جہیز اور بے جا مطالبات، ناخوشگوار شادیاں، تعلیمی دباؤ، والدین کی بے جا محبت وسختی، نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے درمیان بڑھتے ناجائز تعلقات وغیرہ سماج و معاشرے کے ایسے الجھے ہوئے مسائل ہیں جو انسانوں کے اندر ذہنی تناؤ کے اسباب بن رہے ہیں۔ ان مسائل کی وجہ سے بسا اوقات رعنائیوں اور دلکش مناظر سے مزین دنیا بھی سیاہ نظر آنے لگتی ہے۔ لوگ دل برداشتہ ہونے لگتے ہیں اور اپنی جان اپنے ہی ہاتھوں ختم کر لینا ذریعہ نجات تصور کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے ماہرین سماجیات کے نزدیک گھریلو جھگڑے وغیرہ خودکشی کی سب سے بڑی وجہ ہیں۔

اقتصادی مسائل

اقتصادی مسائل خودکشی کی طرف بڑھتے رجحان کا دوسرا اہم سبب ہیں۔ اشیاء خورد ونوش کی فراوانی وبہتات کے باوجود غربت وافلاس کی وجہ سے جہاں فاقہ کش لوگ بھوک کے مر رہے ہیں وہیں جن کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہوتا ہے وہ قبل از وقت اپنے ہاتھوں اپنی موت کو دعوت دے رہے ہیں۔ بے روزگاری، فصلوں کی تباہی، بزنس کا دیوالیہ ہوجانا اور ملازمت کے حصول میں ناکامی ایسے اقتصادی مسائل ہیں جو خودکشی کے اسباب بن رہے ہیں۔ ہندوستان میں جہاں غربت وافلاس اور بڑھتی ہوئی بے روزگاری مسئلے کھڑے کر رہے ہیں، وہیں فصلوں کی تباہی اور کسانوں کی خودکشیاں لمحہ فکریہ ہے، جس نے معاشرے کے ہر طبقے کو سوچنے اور غور وفکر کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔

NCRB (نیشنل کرائم ریکارڈ بیورو) کی رپورٹ کے مطابق ہندوستان میں یومیہ 46 کسان خودکشی کر کے اپنی جان لیتے ہیں۔ یہ تعداد زیادہ بھی ہو سکتی ہے۔ ہندوستان میں کسانوں کی خودکشی شرح 2.11 فیصد ہے۔ اسی طرح بے روزگاری وغیرہ کے سبب بھی خودکشی کے رجحان تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ عالمی ادارۂ صحت WHO کے جائزے کے مطابق خودکشی کرنے والوں میں سے ایک تہائی کا تعلق کم آمدنی والے طبقے سے ہے۔ اس کی روک تھام کے لیے حکومت کے ساتھ سماجی کارکنان کو بھی آگے آنے کی ضرورت ہے۔

نفسیاتی مسائل

نفسیاتی مسائل بھی خودکشی کی بڑی وجہ ہیں۔ جتنی تیزی سے دنیا ترقی کی جانب رواں ہے اتنی تیزی سے نفسیاتی مسائل سے لوگ دوچار ہو رہے ہیں۔ ڈپریشن (Depression)، اینزائٹی (Anxiety)، اسٹریس (Stress) کچھ ایسے نفسیاتی مسائل ہیں جنہیں ٹینشن کہا جاتا ہے۔ ذہنی ونفسیاتی تفریحات کے لیے نئی نئی ایجادات کے باوجود اس میں روز اضافہ ہی ہو رہا ہے۔ مشترکہ خاندانی نظام کی تنزلی، انسانوں کے بدلتے رویے، دنیا کی ہوس، ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی چاہت، باہمی تعاون کا فقدان اور لاعلاج مرض وغیرہ کچھ وجوہات ہیں جن کی وجہ سے دن بدن نفسیاتی مسائل میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ان مسائل سے دوچار لوگوں کو دنیا اپنی وسعت کے باوجود تنگ نظر آنے لگتی ہے۔ کسی کو اپنا مددگار ومعاون نہیں پاتا اور بالآخر گردش حالات سے تنگ آکر سب سے جدا ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ اسمارٹ فون اور انٹرنیٹ کا بے جا استعمال اسمارٹ فون اور انٹرنیٹ لوگوں کی ایک ضرورت ہے۔ اس کی وجہ سے جہاں انسانوں سے روابط آسان ہو گئے۔ دنیا کے کسی کونے میں بسنے والے سے اتصال ممکن ہو گیا ہے، انٹرنیٹ میں معلومات کا ذخیرہ ہے، مطلوبہ شئی سکینڈوں میں دستیاب ہو جاتی ہے وہیں اس کے بے جا اور غلط استعمال سے سماج و معاشرے اور خصوصاً نوجوانوں اور بچوں پر مضر اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ اس کے بے جا اور ضرورت سے زیادہ استعمال نے لوگوں کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا، آپسی تعلقات ختم ہو گئے، جس کے سبب لوگ مختلف ذہنی و جسمانی عوارض وامراض کے شکار ہو رہے ہیں، متعدد ذرائع کے مطابق لوگوں میں بڑھتے ڈپریشن کی ایک اہم وجہ اسمارٹ فون اور انٹرنیٹ کا بے جا استعمال ہے۔ امریکہ کے ''فلوریڈا اسٹیٹ انٹرنیشنل اسکول'' کے محققوں کے مطابق اسمارٹ فون پر زیادہ وقت گذارنے سے خودکشی کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔ تھومس جوئنز کا کہنا ہے کہ اسکرین پر زیادہ وقت گذارنے اور خودکشی کے خیال آنے اور اس کی کوشش کرنے کے درمیان گہرا ربط ہے۔ پانچ گھنٹے یا اس سے زیادہ وقت اسمارٹ فون اور انٹرنیٹ میں گذارنے سے 48 فیصد لوگوں میں خودکشی سے متعلق کارکردگی دیکھی گئی ہے۔ سنٹر فور ڈیزیز کنٹرول کے مطابق 2010 کے بعد 12 اور 18 کی عمر کے بچوں میں خودکشی کے شرح میں حیرت انگیز طور پر اضافہ ہوا ہے۔ اس میں لڑکیوں کی تعداد زیادہ ہے۔ (۱)

یہ تو کچھ اعداد وشمار ہیں جب کہ اسمارٹ فون اور انٹرنیٹ سے ہونے والے نقصانات ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں۔ گذشتہ کچھ مہینوں سے ایک گیم ''بلیو ویل'' نے جلے پر نمک کا کام کیا ہے جس کے فریب میں آکر کئی معصوموں، والدین اور اہل خانہ کئے لیے مستقبل کے امید نوجوانوں نے اپنے پیارے والدین اور اعزاء اقارب کو داغ مفارقت دے گئے ہیں۔

نشہ آور اشیاء کا استعمال

موجودہ سماج ومعاشرے میں نشہ آور اشیاء کا استعمال عام ہی نہیں بلکہ ایک فیشن ہو گیا ہے۔ نشہ کے شکار طبقہ اپنی ذمہ داری سے بے پرواہ اپنی دنیا میں مست مگن ہو کر زمین میں فتنہ وفساد کا سبب بن رہے ہیں۔ نشہ آور اشیاء کی کھلے عام فروخت اور اس کا استعمال معاشرے کو گھن کی طرح کھا رہا ہے۔ اس کا استعمال بلاواسطہ جسمانی، نفسیاتی اور جذباتی نقصان کی صورت میں ظاہر ہو رہا ہے۔ گذشتہ کچھ سالوں میں منشیات کے استعمال سے خودکشی کے رجحان یا حالت نشہ میں خودکشی کے واقعات میں کافی اضافہ ہوا ہے اور ہو

> اللہ کی ربوبیت، اس کی خالقیت، مالکیت، رزاقیت اور جملہ صفات حمیدہ پر ایمان جازم ایسی قوت وطاقت فراہم کرتا ہے جو دنیائے فانی میں ہر طرح کی مصائب ومشکلات کے تھپیڑوں کے روبرو ہونے اور سامنا کرنے کا مادہ رکھتی ہے۔ جس کے اندر زمین وآسمان، سورج، چاند، ستارے، پہاڑ، جنگل، دری، درخت، حیوانات ونباتات کے خالق ومالک اور رازق کا تصور ہو وہ کبھی بھی دنیا کے چند ساعتوں کی مشکلات ومصائب سے گھبرا کر یا مایوسی وناامیدی کا شکار ہو کر اپنی عزیز جان کا دشمن نہیں بن سکتا ہے۔

بھی کیوں نہیں جب کہ قرآن نے اس کی قباحت وشناعت اور اس کے نقصانات سے پہلے ہی باخبر کردیا ہے: إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ، إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَن يُوقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَن ذِكْرِ اللَّهِ وَعَنِ الصَّلَاةِ فَهَلْ أَنتُم مُّنتَهُونَ۔(سورۃ المائدۃ: ۹۰)

"اے ایمان والو! بات یہ ہے کہ شراب اور جوا اور تھان اور فال نکالنے کے پانسے کے تیر یہ سب گندی باتیں، شیطانی کام ہیں، ان سے بالکل الگ رہوتا کہ تم فلاح یاب ہو۔ شیطان تو یوں چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعے سے تمہارے آپس میں عداوت اور بغض واقع کرادے اور اللہ تعالی کی یاد سے اور نماز سے تم کو باز رکھے، سواب بھی باز آجاؤ۔"

تعجب خیز بات یہ ہے کہ اس کے روک تھام کے لیے حکومت ومعاشرہ کی نہ کوئی منظم کارکردگی ہے اور نہ ہی اس کے تعلق سے وہ سنجیدہ ہیں۔ خودکشی کے بڑھتے رجحان کے یہ چند اسباب وعوامل ہیں ان کے علاوہ اور بھی اسباب ہوسکتے ہیں۔ جیسے تعلیم میں ناکامی، ملازمت چھوٹنے کا دردسر وغیرہ۔

حل

خودکشی کے لوگوں میں بڑھتے رجحان کو دیکھ کر گذشتہ کچھ سالوں میں کچھ تحریکیں متحرک ہوئی ہیں اور اس کی روک تھام کے لیے لائحہ عمل اور تجاویز پیش کرنے کے ساتھ عملی میدان میں بھی اتری ہیں۔ جیسا کہ عالمی ادارۂ صحت WHO خودکشی کے واقعات میں سنہ 2020ء تک دس فیصد کمی لانا چاہتا ہے لیکن اس کے دائرے عمل میں صرف 28 ممالک ہیں۔ برطانیہ میں خودکشی کے خلاف مہم چلانے والے "جانی بینجامن" کے مطابق خودکشی کے بارے میں لوگوں کی آگاہی ہونی چاہئے، انہیں علم ہونا چاہئے کہ خودکشی کا سوچنے والوں کے ساتھ کس طرح پیش آیا جائے۔ ساتھ ہی اسکولی سطح پر اس کے متعلق تعلیم ہونی چاہئے۔

جہاں تک خودکشی کے روک تھام کے لیے اسلامی تعلیمات کی بات ہے تو اسلام ایک طرف گذشتہ سطور میں بیان کیے گئے اسباب وعوامل سے پریشان افراد کے متعلقین، اعزاء واقارب سے مطالبہ کرتا ہے کہ حتی المقدور ان کی الجھنیں ختم کی جانے کی کوشش کی جائیں، ان کے درد کا مداوا کیا جائے۔ والدین، اولاد، اہل خاندان، رشتہ دار، دوست اپنی اپنی ذمہ داری ادا کرتے ہوئے ان کے لیے سامان سکون فراہم کریں، حکومت اپنی ذمہ داری نبھاتے ہوئے حقوق کی ادائیگی کرے، ان کی مشکلات و پریشانیوں کو دور کرکے اسے جرم عظیم سے بچنے کا ذریعہ بنے۔ وہیں گردش حالات سے مایوس وناامید لوگوں کے لیے رہنمائی کرتا ہے۔ درج ذیل سطور میں خودکشی کی روک تھام میں اہم کردار ادا کرنے والی کچھ اسلامی تعلیمات اجاگر کی جاتی ہیں۔

خودکشی کی مذمت

زندگی اللہ کی طرف سے عطا کردہ انسانوں کے لیے سب سے بڑی نعمت ہے۔ دنیا اور اس کی نعمتیں انسانوں کی لطف واندوزی کے لیے پیدا کی گئی ہیں۔ موت وحیات کا حق صرف اسی کو ہے اس میں کسی طرح کی دخل اندازی اس کے نظام کو چیلنج کرنا ہے، خودکشی بھی اس کے نظام موت وحیات کو چیلنج کرنے کے مترادف ہے جو ناقابل معافی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام سب سے پہلے خودکشی کی سخت مذمت کرتا ہے، اور لوگوں کو اس سے نفرت دلاتا ہے۔ قرآن واحادیث میں اسے بزدلانہ عمل قرار دیا گیا ہے، اللہ رب العالمین نے جان کو ہلاکت میں ڈالنے سے منع کیا ہے، ارشاد ہے:

وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ۔(سورۃ البقرۃ: ۱۹۵)

"اور اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ پڑو۔"

وَلَا تَقْتُلُوا أَنفُسَكُمْ إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا۔(سورۃ النساء: ۲۹)

"اور اپنے آپ کو قتل نہ کرو یقیناً اللہ تعالیٰ تم پر نہایت مہربان ہے۔"

اسلام میں قبل از وقت موت کی تمنا کرنا بھی منع ہے پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ خودکشی کی اجازت دے۔ راوی حدیث حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسولؐ نے فرمایا: لایتمنین احد کم الموت لضر نزل بہ، فان کان لابد متمنیا للموت فلیقل اللھم احینی ماکانت الحیاۃ خیر الی وتوفنی اذا کانت الوفاۃ خیر الی۔(۲)

"تم میں سے کوئی کسی مصیبت کے آنے سے موت کی تمنا نہ کرے، ہاں اگر موت کی تمنا کرنا ضروری ہوجائے تو کہے، اللہ تو مجھے زندہ رکھ جب تک میرے لیے زندگی بہتر ہے اور مجھے وفات دے جب میرے لیے موت بہتر ہو۔"

خودکشی کرنے والا جہاں اپنے ہاتھوں اپنی دنیا ختم کرلیتا ہے وہیں اسے آخرت میں سخت عذاب ہوگا۔

عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ قال: قال رسول ﷺ من قتل نفسہ بحدیدۃ فحدیدتہ فی یدہ یتوجہ بھا فی بطنہ فی نار جھنم خالدا مخلدا فیھا ابدا ، و من شرب سما فقتل نفسہ فھو یتحساہ فی نار جھنم خالدا مخلدا فیھا ابد ، ومن تردی من جبل وقتل نفسہ فھو یتردی فی نار جھنم خالدا مخلدا فیھا ابدا (۳)

”راوی حدیث حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسولؐ نے فرمایا: جو شخص کسی لوہے سے اپنے آپ کو قتل کرلے تو وہ جہنم میں ہوگا، اس کے ہاتھ میں لوہا ہوگا جس وہ اپنے پیٹ میں ہمیشہ ہمیش بھونپتا رہے گا، اور جو زہر پی کر اپنے آپ کو ہلاک کرلے تو وہ جہنم میں ہوگا اور ہمیشہ ہمیش زہر پیتا رہے گا اور جو پہاڑ سے گرا کر خودکشی کرلے وہ جہنم ہوگا اور برابر گرتا رہے گا۔“

اللہ پر ایمان

اللہ کی ربوبیت، اس کی خالقیت، مالکیت، رزاقیت اور جملہ صفات حمیدہ پر ایمان جازم ایسی قوت وطاقت فراہم کرتا ہے جو دنیائے فانی میں ہر طرح کی مصائب و مشکلات کے تھپیڑوں کے روبرو ہونے اور سامنا کرنے کا مادہ رکھتی ہے۔ جس کے اندر زمین وآسمان، سورج، چاند، ستارے، پہاڑ، جنگل، دریا، درخت، حیوانات ونباتات کے خالق و مالک اور رازق کا تصور ہو وہ کبھی بھی دنیا کے چند ساعتوں کی مشکلات ومصائب سے گھبرا کر یا مایوسی وناامیدی کا شکار ہو کر اپنی عزیز جان کا دشمن نہیں بن سکتا ہے۔ کیوں کہ اس کے علم میں ہوتا ہے کہ اللہ وہ ہے: لِلّٰہِ مُلْکُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا فِیهِنَّ وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ۔ (سورۃ المائدۃ: ۱۲۰)
”اللہ ہی کی ہے سلطنت آسمانوں کی اور زمین کی اور ان چیزوں کی جو ان میں موجود ہیں اور وہ ہر شے پر پوری قدرت رکھتا ہے۔“
اللَّهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ وَكِيلٌ۔ (سورۃ الزمر: ۶۲) ”اللہ ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے اور وہ ہر چیز پر نگہبان ہے۔“
اس کا وعدہ ہے: وَمَا مِن دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا كُلٌّ فِي كِتَابٍ مُّبِينٍ۔ (سورۃ ھود: ۶)
”زمین پر چلنے پھرنے والے جتنے جاندار ہیں سب کی روزیاں اللہ تعالی پر ہیں، وہی ان کے رہنے سہنے کی جگہ کو جانتا ہے اور ان کے سونپے جانے کی جگہ بھی، سب کچھ واضح کتاب میں موجود ہے۔“
اس کا فرمان ہے: أَهُمْ يَقْسِمُونَ رَحْمَتَ رَبِّكَ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُم مَّعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُم بَعْضًا سُخْرِيًّا وَرَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ۔ (سورۃ الزخرف: ۳۲)
”کیا آپ کے رب کی رحمت کو یہ تقسیم کرتے ہیں؟ ہم نے ہی ان کی زندگانی دنیا کی روزی ان میں تقسیم کی ہے اور ایک کو دوسرے سے بلند کیا ہے تا کہ ایک دوسرے کو ماتحت کرلے جسے یہ لوگ سمیٹتے پھرتے ہیں اس سے آپ کے رب کی رحمت بہت ہی بہتر ہے۔“
اور حدیث نبویؐ ہے: لو انکم تتوکلون علی اللہ حق توکلہ لرزقکم کما یرزق الطیر تغدو خماصا وتروح بطانا۔ (۴)
”اگر تم کما حقہ اللہ پر بھروسہ کرنے لگو تو وہ تمہیں ایسے ہی رزق دے گا جیسے پرندوں کو دیتا ہے جو صبح خالی پیٹ نکلتے ہیں اور شام کو سیر ہو کر واپس آتے ہیں۔“

تقدیر پر ایمان

تقدیر پر ایمان (یعنی حیات مستعار میں رونما ہونے والی تمام واقعات و حادثات، اس کے اعمال وافعال، حرکات وسکنات کا کسی کتاب میں پہلے سے لکھا ہونا) ایمان خوشی وغمی ہر طرح کے حالات سے مقابلہ کرنے کا ہنر سکھاتا ہے، پہاڑوں جیسی مصائب ومشکلات سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ پیدا کرتا ہے۔ اس پر ایمان رکھنے والا شخص بخوبی واقف ہوتا ہے کہ اس کی مضبوطیاں، اس کی کمزوریاں، اس کے ساتھ پیش آنے والے واقعات وحادثات اس کے تقدیر کے حصے ہیں جو بحکم الہی ہے، جو کتاب مبین میں پہلے سے مکتوب ہے، جن پر نوحہ و ماتم اور جن سے راہ فرار اختیار کرنا لاحاصل عمل ہے۔ اس کے سامنے حکم الہی ہوتا ہے۔: قُل لَّن يُصِيبَنَا إِلَّا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَنَا هُوَ مَوْلَانَا وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ۔ (سورۃ التوبۃ: ۵۱)
”آپ کہہ دیجئے کہ ہمیں سوائے اللہ کے ہمارے حق میں لکھے ہوئے کہ کوئی چیز پہنچ ہی نہیں سکتی وہ ہمارا کارساز اور مولی ہے۔ مومنوں کو تو اللہ کی ذات پاک پر ہی بھروسہ کرنا چاہئے۔“
مَا أَصَابَ مِن مُّصِيبَةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي أَنفُسِكُمْ إِلَّا فِي كِتَابٍ مِّن قَبْلِ أَن نَّبْرَأَهَا إِنَّ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ۔ (سورۃ الحدید: ۲۲)
”نہ کوئی مصیبت دنیا میں آتی ہے نہ (خاص) تمہاری جانوں میں، مگر اس سے پہلے کہ ہم اس کو پیدا کریں وہ ایک خاص کتاب میں لکھی ہوئی ہے۔ یہ (کام) اللہ تعالی پر (بالکل) آسان ہے۔“
وَاللَّهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُونَ۔ (سورۃ الصافات: ۹۶)
”حالاں کہ تمہیں اور تمہاری بنائی ہوئی چیزوں کو اللہ ہی نے پیدا کیا ہے۔“
نبیؐ کا ارشاد ہے: کتب اللہ مقادیر الخلائق قبل ان یخلق السماوات والارض بخمسین الف سنۃ۔ (۵)
”اللہ تعالی نے مخلوقات کی تقدیر کو آسمانوں وزمین کی تخلیق سے پانچ ہزار سال پہلے ہی لکھ دیا ہے۔“
کل شئی بقدر حتی العجز والکیس۔ (۶)
”ہر چیز تقدیر کے مطابق ہے یہاں تک بے وقوفی اور عقلمندی بھی۔“

آخرت پر ایمان

آخرت پر سچا وپکا ایمان (یعنی موت کے بعد دوبارہ ہماری بعثت ہوگی اور دنیا میں کئے گئے افعال واعمال کے متعلق پرسش ہوگی) انسان کو اپنے نفس کا محاسبہ کرنے، اپنے اعمال کا جائزہ لینے کا احساس دلاتا ہے، اس کے اندر جواب دہی کا شعور پیدا کرتا ہے، اور کسی بھی عمل کے انجام کے بارے میں غور وفکر کی ترغیب دیتا ہے، ساتھ ہی اس کے انجام سے آگاہ کرتا ہے۔ آخرت پر ایمان رکھنے والے کو معلوم ہوتا ہے کہ آخرت میں اس کے تمام اعمال حسنہ وسیہ کا محاسبہ ہوگا اور جس کا وہ جواب دہ ہوگا۔ لہذا کوئی بھی ایسے غلط قدم اٹھانے سے پہلے وہ غور وفکر کرے گا جس کا آخرت میں اس کے پاس جواب نہ ہو۔ اللہ کا فرمان ہے: إِنَّ إِلَيْنَا إِيَابَهُمْ۔ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُم۔ (سورۃ الغاشیۃ: ۲۵۔۲۶)
”بے شک ہماری طرف ان کا لوٹنا ہے، پھر بے شک ہمارے ذمہ ہے ان سے حساب لینا۔“
وَنَضَعُ الْمَوَازِينَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَإِن كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ أَتَيْنَا بِهَا وَكَفَىٰ بِنَا حَاسِبِينَ۔ (سورۃ الانبیاء: ۴۷)
”قیامت کے دن ہم درمیان میں لا رکھیں گے ٹھیک ٹھیک تولنے والی ترازو کو، پھر کسی پر کچھ بھی ظلم نہ کیا جائے گا۔ اور اگر ایک رائی کے دانے کے برابر بھی عمل ہوگا ہم اسے لا حاضر کریں گے، اور ہم کافی ہیں حساب کرنے والے۔“

مَن جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ أَمْثَالِهَا وَمَن جَاءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلاَ يُجْزَى إِلاَّ مِثْلَهَا وَهُمْ لاَ يُظْلَمُونَ۔ (سورۃ الانعام: ۱۶۰)

"جو شخص نیک کام کرے گا اس کو اس کے دس گنا ملیں گے اور جو شخص برا کام کرے گا اس کو اس کے برابر ہی سزا ملے گی اور ان لوگوں پر ظلم نہ ہوگا۔"

حدیث نبویؐ ہے۔ ان اللہ یدنی المؤمن فوضع علیه کنفه و یستره فیقول اتعرف ذنب کذا، اتعرف ذنب کذا فیقول نعم، ای رب حتی اذا قرره بذنوبه، و رای فی نفسه انه هلک قال: سترتها علیک فی الدنیا و انا اغفرها لک الیوم فیعطی به کتاب حسناته۔ و اما الکافر و المنافقون: "وَيَقُولُ الأَشْهَادُ هَـؤُلاء الَّذِينَ كَذَبُواْ عَلَى رَبِّهِمْ أَلاَ لَعْنَةُ اللّهِ عَلَى الظَّالِمِينَ" (ھود: ۱۸)۔ (۷)

"اللہ تعالی مومن کو قریب کرے گا، اس کے اوپر اپنا جانب رکھے گا، اس کو چھپائے گا اور پوچھے گا کیا تمہیں یہ گناہ معلوم ہے، کیا تم اس گناہ کو جانتے ہو، تو وہ کہے گا، ہاں! اے میرے رب، جب وہ اپنے تمام گناہوں کو اقرار کرلے گا اور خیال کرے گا کہ وہ ہلاک ہو گیا تو اللہ کہے گا، میں نے دنیا میں ان گناہوں کی ستر پوشی کی لہذا آج میں تمہارے لیے ان کو معاف کر رہا ہوں، اور اسے اس کا نامہ اعمال دے دیا جائے گا۔ جہاں تک کافر اور منافق تو ان کے بارے میں (سارے گواہ کہیں گے کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے پروردگار پر جھوٹ باندھا، خبردار ہو کہ اللہ کی لعنت ہے ظالموں پر۔)"

یہ وہ اسلام کے بنیادی عقائد ہیں جن پر ایمان رکھنے والا شخص خودکشی کرنا تو درکنار خودکشی کا تصور یا اس جیسے حرکات و سکنات اس کے حاشیہ خیال میں بھی نہیں آئے گا۔ یہی وجہ کہ اسلامی ممالک میں جو ان عقائد پر ایمان رکھتے ہیں خودکشی کے واقعات نسبتا بہت کم واقع ہوتے ہیں۔

صبر سب سے بڑی طاقت ہے

پورے عزم و ارادے اور استقامت و پامردی کے ساتھ حالات کا مقابلہ کرنے کا نام صبر ہے۔ صبر مصائب و مشکلات کا سامنا کرنے کے لیے سب سے بڑی طاقت ہے۔ یہ ہر طرح کے غم و دکھ کا مقابلہ کرنے کا جوش و ولولہ پیدا کرتا ہے، اس کا پیکر مصائب و مشکلات کے طوفان میں پہاڑ کی طرح ثابت قدم نظر آتا ہے، یہ مضبوط انسان کی پہچان ہے جب کہ نوحہ و ماتم کناں ہونا کمزوری و بزدلی کی دلیل ہے۔ اسلام کی یہی تعلیم ہے کہ ہر طرح کے دکھ سکھ میں مرض و موت، یاروں کے بچھڑنے کا غم، برنس کا دیوالیہ فصلوں کی تباہی وغیرہ میں صبر کا دامن لازم پکڑا جائے۔ ایسے لوگوں کے ساتھ ہمیشہ اللہ کی نصرت و مدد ہوتی ہے: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ اسْتَعِينُواْ بِالصَّبْرِ وَالصَّلاَةِ إِنَّ اللّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ۔ (سورۃ البقرۃ: ۱۵۳)

"اے ایمان والو! صبر اور نماز کے ذریعہ مدد چاہو، اللہ تعالی صبر والوں کا ساتھ دیتا ہے۔"

صبر سے متصف لوگوں کی قرآن و احادیث میں تعریف کی گئی ہے: وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاء والضَّرَّاء وَحِينَ الْبَأْسِ أُولَـئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَأُولَـئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ۔ (سورۃ البقرۃ: ۱۷۷)

"تنگ دستی، دکھ اور لڑائی کے وقت صبر کرے، یہی سچے لوگ ہیں اور یہی پرہیزگار رہیں۔"

حدیث نبویؐ ہے: عجبا لامر المؤمن، ان امره کله خیر لیس ذلک لاحد الا المؤمن ان اصابته سراء شکر فکان خیر اله و ان اصابته ضراء صبر فکان خیر اله۔ (۸)

"مومن کا معاملہ بڑا عجیب ہے، اس کے ہر کام میں خیر ہے، یہ صرف مومن ہی کے لیے ہے، اگر اسے خوشی نصیب ہوتی ہے تو وہ اللہ کا شکر گزار ہوتا ہے اور اگر تکلیف پہنچتی ہے تو وہ صبر کرتا ہے جو اس کے لیے بہتر ہے۔"

اطمینان قلب کے ذرائع

یہاں ذہنی سکون اور قلبی اطمینان کے لیے اسلامی ذرائع پیش کیے جا رہے ہیں۔

قرآن کریم سے تعلق

دنیا کے الجھنوں سے مضطرب دلوں، پیاروں سے بچھڑنے والوں، غم کے ماروں اور چین و سکون کے متلاشیوں کے لیے قرآن کریم ایسا ذہنی و قلبی اطمینان و سکون فراہم کرتا ہے جو اس کے علاوہ کہیں نہیں مل سکتا ہے۔ یہ جہاں دھوکہ کھائے ہوئے لوگوں کے لیے باوفا دوست ہے وہیں امراض و مشکلات اور گردش ایام کے کھائے ہوئے ٹھوکروں سے چور کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہے، جملہ امراض عوارض سے نجات دہندہ ہے۔ ارشاد ہے: وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَاء وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ وَلاَ يَزِيدُ الظَّالِمِينَ إَلاَّ خَسَارًا۔ (سورۃ بنی اسرائیل: ۸۲)

"یہ قرآن جو ہم نازل کر رہے ہیں مومنوں کے لیے تو سراسر شفا اور رحمت ہے۔ ہاں ظالموں کو بجز نقصان کے اور کوئی زیادتی نہیں ہوتی۔"

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءتْكُم مَّوْعِظَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَشِفَاء لِّمَا فِي الصُّدُورِ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ۔ (سورۃ النساء: ۲۹)

"اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ایک ایسی چیز آئی ہے جو نصیحت ہے اور دلوں میں جو روگ ہیں ان کے لیے شفا ہے اور رہنمائی کرنے والی ہے اور رحمت ہے ایمان والوں کے لیے۔"

یہ جہاں جسمانی امراض کے لیے نسخہ شفا ہے وہیں صدور و قلوب کے ہر شبہات و شہوات کا ازالہ کرنے والا ہے۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ قرآن مجید ایسے دلائل و براہین سے پر ہے جو علم تصور اور ادراک کے ذریعہ سارے فاسد شبہات کو ختم کر دیتے ہیں۔ اس میں ایسی حکمت و موعظت اور قصص ہیں جو ترغیب و ترہیب کے ذریعہ سے دلوں کا اصلاح کرتے ہیں۔ جو دل کو نفع بخش عمل کی طرف راغب اور مضر عمل سے نفرت دلاتے ہیں، جس کے سبب ایک باغی، راہ راست کو ناپسند کرنے والا دل بغاوت کو ترک کر کے راہ راست کا خوگر ہو جاتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں اگر کوئی اپنے دل کا اصلاح کرنا چاہے تو وہ اسی طرح فطرت کی طرف لوٹ آئے گا جس طرح بدن مرض کے بعد حالت طبعی میں لوٹ آتا ہے۔ (۹)

یہی وجہ کہ صحابہ کرام اور سلف صالحین تلاوت قرآن کے ذریعہ ذہنی اضطراب دور کرتے تھے اور اپنی بیماروں کا علاج کیا کرتے تھے۔

ذکر و اذکار اور دعا

اللہ رب العالمین کی تسبیح و تحمید، اس سے ہمہ وقت تعلق کا احساس، اس کے سامنے دست بدعا ہو کر اپنی عاجزی و بے بسی کا اظہار اور اپنی پریشانیوں اور مشکلوں کو بیان کر کے اس سے فریاد کرنا جہاں اس کی نصرت و مدد کا موجب ہے وہیں اس سے انسان کو ذہنی و قلبی چین و سکون، فرحت و انبساط نصیب ہوتی ہے۔ اللہ کا ارشاد ہے۔ الَّذِينَ آمَنُواْ وَتَطْمَئِنُّ قُلُوبُهُم بِذِكْرِ اللّهِ أَلاَ بِذِكْرِ اللّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ۔ (سورۃ الرعد: ۲۸)

"جو لوگ ایمان لائے ان کے دل اللہ کے ذکر سے اطمینان حاصل کرتے ہیں۔ یاد رکھو اللہ کے ذکر سے ہی دلوں کو تسلی حاصل ہوتی ہے۔"

وَذَكِّرْ فَإِنَّ الذِّكْرَى تَنفَعُ الْمُؤْمِنِين۔(سورۃ الزاریات:۵۵)’اور نصیحت کرتے رہیں یقیناً یہ نصیحت ایمان داروں کو نفع دے گی۔‘‘

ذکر کرنے والوں کو اللہ یاد کرتا ہے: فَاذْكُرُونِيْ أَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُواْ لِيْ وَلاَ تَكْفُرُون۔(سورۃالبقرۃ:۱۵۲)

’’اس لئے تم میرا ذکر کرو، میں بھی تمہیں یاد کروں گا، میری شکر گزاری کرو اور ناشکری سے بچو۔‘‘

حدیث نبویؐ ہے: لا یقعد قوم یذکرون اللہ الا حفتھم الملائکۃ وغشیتھم الرحمۃ ونزلت علیھم السکینۃ وذکرھم اللہ فیمن عندھم۔(۱۰)

’’جب کوئی قوم اللہ کے ذکر کے لیے بیٹھتی ہے تو فرشتے اسے گھیر لیتے ہیں، اسے رحمت ڈھانپ لیتی ہے، سکینت کا نزول ہوتا ہے اور اللہ اپنے پاس موجود مخلوق میں اس کا تذکرہ کرتا ہے۔‘‘

اذا تقرب عبدی منی شبرا تقربت منہ ذراعا و اذا تقرب منی ذراعا تقربت منہ باعا او بوعا و اذا اتانی یمشی اتیتہ ھرولۃ۔(۱۱)

’’جب بندہ مجھ سے ایک بالشت قریب ہوتا ہے تو میں اس سے ایک بازو قریب ہوتا ہوں اور جب وہ ایک بازو قریب ہوتا ہے تو میں اس سے ایک بوع (دونوں ہاتھوں کے پھیلانے کی مقدار) قریب ہوتا ہوں، اگر وہ میری طرف چل کر آتا ہے تو میں اس کی طرف دوڑ کے آتا ہوں۔‘‘

صدقہ وخیرات اور خدمت خلق

دماغی و ذہنی پریشانیوں میں الجھے ہوئے لوگوں کے لیے صدقہ وخیرات، خدمت خلق، مصیبت زدہ، تنگدست، بے سہارا اور نادار افراد کی جانب دست تعاون دراز کرنا چین وسکون حاصل کرنے کا اہم ذریعہ ہے۔ اس سے جہاں ایک انسان بے سہارا لوگوں کی مدد کرکے ان کی ضرورتیں پوری کرتا ہے اور خدمت خلق کا فریضہ انجام دے کر ذہنی فرحت وانبساط محسوس کرتا ہے وہیں غریبوں اور نادار لوگوں کی اس کے اصلاح حال کے لیے دعائیں ملتی ہیں اور اللہ بھی اس سے خوش ہوتا ہے۔ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: الَّذِيْنَ يُنفِقُونَ فِيْ السَّرَّاءِ وَالضَّرَّاءِ وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ وَاللّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْن۔(سورۃ آل عمران:۱۳۴)

’’جو لوگ آسانی اور سختی کے موقعہ پر بھی اللہ کے راستے میں خرچ کرتے ہیں، غصہ پینے والے اور لوگوں سے درگزر کرنے والے ہیں، اللہ تعالی ان نیک کاروں سے محبت کرتا ہے۔‘‘

الَّذِيْنَ يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُم بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرّاً وَعَلاَنِيَةً فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلاَ خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلاَ هُمْ يَحْزَنُون۔(سورۃ البقرۃ:۲۷۴)

’’جو لوگ اپنے مالوں کو رات دن چھپے کھلے خرچ کرتے ہیں ان کے لیے ان کے رب تعالی کے پاس اجر ہے اور نہ انہیں خوف ہے اور نہ غمگین۔‘‘

الَّذِيْنَ يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّهِ ثُمَّ لاَ يُتْبِعُونَ مَا أَنفَقُواُ مَنّاً وَلاَ أَذًى لَّهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلاَ خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلاَ هُمْ يَحْزَنُونَ۔(سورۃ البقرۃ:۲۶۲)

’’جو لوگ اپنا مال اللہ تعالی کی راہ میں خرچ کرتے ہیں پھر اس کے بعد نہ تو احسان جتاتے ہیں نہ ایذا دیتے ہیں، ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے ان پر نہ تو کچھ خوف ہے نہ وہ اداس ہوں گے۔‘‘

حدیث نبویؐ ہے: انفق یا ابن آدم فانفق فیک۔(۱۱) ’’اے ابن آدم خرچ کرو میں تم پر خرچ کروں گا۔‘‘

ان الصدقۃ لتطفئی غضب الرب وتدفع میتۃ السوء۔(۱۳)

’’صدقہ رب کے غضب کو ٹھنڈا کر دیتا ہے اور بری موت سے بچاتا ہے۔‘‘

قال رسول ﷺ من نفس عن مومن کربۃ من کرب الدنیا نفس اللہ عنہ کربۃ من کرب یوم القیامۃ، ومن یسر علی معسر یسر اللہ علیہ فی الدنیا والآخرۃ، ومن ستر مؤمنا ستر اللہ فی الدنیا الآخرۃ، واللہ فی عون العبد ما کان العبد فی عون اخیہ۔(۱۴)

’’نبی کریم ﷺ نے فرمایا جو کسی مومن کی دنیا کی مصیبتوں میں سے کوئی مصیبت دور کرے گا اللہ اس کو قیامت کی مصیبتوں سے بچائے گا، جو کسی مسلمان محتاج پر آسانی کرے گا اللہ تعالی اس پر دنیا اور آخرت میں آسانی کرے گا، جو کسی مسلمان کی پردہ پوشی کرے گا اور تعالی اس کی پردہ پوشی کرے گا، اور جب تک بندہ اپنے مسلمان بھائی کی مدد میں لگا رہے گا اللہ تعالی اس کی مدد میں لگا رہے گا۔‘‘

آخری بات

اسلام میں زندگی اللہ رب العالمین کی ایک بیش بہا نعمت سمجھی جاتی ہے، یہ ایسی نعمت ہو جو صرف ایک بار نصیب ہوتی ہے، زندگی کے گردش حالات اور اس کے موجوں کے تھپیڑوں سے گھبرا کر خود اپنے ہاتھوں اپنی جان گنوا دینا حماقت و بے وقوفی ہے۔ اگر اس کے دامن میں کئی محرومیاں، تشنگیاں، پریشانیاں اور دکھ ہیں تو اس کی نعمتوں، محبتوں اور عنایتوں کی بہتات ہے۔

فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْراً، إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرا۔(سورۃ الشرح:۵۔۶)

پس یقینا مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔ بے شک مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔

اگر ہم خود اپنے ہنر سے سماج ومعاشرہ کی چکڑ سے نکل کر اپنی دنیا آپ سجانا چاہیں، اپنی خواہشات کو مختصر کردیں، اپنی ضروریات کی فہرست چھوٹی کردیں، اللہ کی دی ہوئی نعمتوں پر قناعت کرنا سیکھ لیں اور اپنے حال پر مطمئن ہوجائیں تو ایک حسین وجمیل دنیا کی تخلیق کر سکتے ہیں اور فرحت وانبساط، چین وسکون کے ساتھ زندگی کا لطف اٹھا سکتے ہیں۔ یاد رہے کہ خواہشات اور ہوس کی دنیا میں ساری نعمتوں کی فراوانی کے باوجود چین وسکون اور اطمینان نصیب نہیں ہوتی۔

حوالہ جات

(۱) راشٹریہ سہارا، ہندی، دہلی. ۰۲۔۱۲۔۲۰۱۷۔

(۲) ابوعبداللہ، محمد بن اسماعیل، صحیح بخاری، کتاب المرضی: ۵۰۷۱۔

(۳) ابوالحسین، مسلم بن حجاج، صحیح مسلم، کتاب الایمان: ۱۷۵۔

(۴) ابوعیسی، محمد بن عیسی ترمذی، جامع ترمذی، کتاب الزھد: ۲۳۴۴۔

(۵) ابوالحسین، مسلم بن حجاج، صحیح مسلم، کتاب القدر: ۲۶۵۳۔

(۶) ابوالحسین، مسلم بن حجاج، صحیح مسلم، کتاب القدر: ۲۶۵۵۔

(۷) ابوعبداللہ، محمد بن اسماعیل بخاری، صحیح بخاری، کتاب المظالم والغضب: ۲۴۴۱۔

(۸) ابوالحسین، مسلم بن حجاج، صحیح مسلم، کتاب الزھد: ۲۹۹۹۔

(۹) ابن تیمیہ، احمد بن عبدالحلیم، امراض القلوب وشفائھا، ص ۴۔

(۱۰) ابوالحسین، مسلم بن حجاج، صحیح مسلم، کتاب الذکر: ۲۶۹۹۔

(۱۱) ابوالحسین، مسلم بن حجاج، صحیح مسلم، کتاب الذکر: ۲۶۷۵۔

(۱۲) ابوعبداللہ، محمد بن اسماعیل، صحیح بخاری، کتاب النفقات: ۵۳۵۳۔

(۱۳) ابوعیسی، محمد بن عیسی ترمذی، جامع ترمذی، کتاب الزکاۃ: ۶۶۴۔

(۱۴) ابوالحسین، مسلم بن حجاج، صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعا: ۲۶۹۹۔

جدید ڈیموکریسی اور اسلام

سعود فیروز

قسط دوم

ڈیموکریسی کی بنیادی خصوصیات اور نمایاں اقدار

ایتھنز کے سب سے بڑے مدبّر پیرک لز (Perecles) نے اپنی ایک تقریر میں اس وقت کی جمہوریت کی مکمل تصویر کشی کر دی ہے۔ اس میں حقیقی جمہوریت کے بنیادی خدوخال بالکل نمایاں ہیں۔ وہ کہتا ہے:

''ہمارا دستور جمہوری کہلاتا ہے، اس لیے کہ حکومت چند لوگوں کے ہاتھ میں نہیں ہے بلکہ پوری جماعت کے ہاتھ میں ہے۔ ذاتی جھگڑوں میں ہمارا قانون سب کے ساتھ یکساں سلوک کرتا ہے اور انصاف کا دامن کسی حال میں نہیں چھوڑتا ہے اور ہماری رائے عامّہ زندگی کے ہر شعبے میں جہاں کارنمایاں کا موقع ہو، ہنر کی قدر کرتی ہے، کسی فرقے کی رعایت سے نہیں بلکہ کام کی خوبی دیکھ کر۔ ہم سیاسی زندگی میں ہر ایک کو اپنا جوہر دکھانے کا موقع دیتے ہیں اور یہی اصول ہم اپنے روز مرّہ کے باہمی تعلقات میں برتتے ہیں۔ ہمارا ہم سایہ اپنے مذاق کے مطابق خوشی منائے تو ہم اسے نہ تیکھی نظروں سے دیکھتے ہیں نہ برا بھلا کہتے ہیں۔ ہم ان چھوٹی چھوٹی بدتمیزی کی حرکتوں سے پرہیز کرتے ہیں جن کی چوٹ چاہے دکھائی نہ دے مگر جن کے دل پر لگتی ہے انھیں دکھ دیتی ہے۔ ملنے ملانے میں ہم بے ریا اور بامروّت ہیں۔ مگر ہم اپنی ریاست کے انتظامی معاملات میں سختی سے قانون کی پیروی کرتے ہیں۔ جو برسرِ اقتدار ہو ہم اس کا احترام کرتے ہیں اور اس کی فرماں برداری کرتے ہیں۔ قوانین کی اطاعت کرتے ہیں، خصوصاً ان کی جو مظلوموں کی حمایت میں بنے ہوں اور اس اخلاقی معیار کا بہت پاس رکھتے ہیں جس کی خلاف ورزی باعثِ شرم وندامت ہے۔''

پیرک لیز نے اپنی اس تقریر میں ڈیموکریسی کی جو تفصیل بیان کی ہے اس سے ڈیموکریسی کی درج ذیل خصوصیات سامنے آتی ہیں:

- جماعت کے ہاتھ میں حکومت
- قانون کی بالادستی
- قانون کے سامنے سب کی مساوی حیثیت
- انصاف
- ہنر کی قدر
- یکساں مواقع
- رواداری
- تعلقات کی بنیاد خلوص
- اطاعت وفرمانبرداری
- مظلوم کی حمایت
- اخلاقی معیار کی پاسداری

ڈیموکریسی کی نمایاں اقدار کا تعارف کراتے ہوئے ڈاکٹر عبدالحق انصاری لکھتے ہیں:

''جمہوریت کچھ قدروں کا نام بھی ہے۔ جیسے فکر وخیال کی آزادی، ہر عقیدہ و مذہب کی آزادی، بنیادی حقوق کا تحفظ۔ قانون کے سامنے سب کی یکساں حیثیت، ہر ایک کے لئے ترقی کے یکساں مواقع۔ اسی جمہوریت میں عوام اپنے منتخب نمائندوں کا احتساب کرنے، حکومت کی کارکردگی کا جائزہ لینے اور ایک وقت کے بعد ان کو معزول کرنے کا بھی حق حاصل رہتا ہے۔''

(سیکولرزم، جمہوریت اور انتخابات، عبدالحق انصاری، مطبوعہ مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، صفحہ 07)

ڈیموکریسی کا اردو ترجمہ

ایک زبان کی اصطلاح کا کسی دوسری زبان میں ترجمہ کرنا بڑا نازک اور ذمہ دارانہ عمل ہے۔ اصطلاحات کا معاملہ عام الفاظ کی طرح نہیں ہوتا۔ کسی عام لفظ کے کئی معنی ضرور ہو سکتے ہیں لیکن وہ متعین اور معلوم ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کا ترجمہ کرنے میں بہت زیادہ دقت نظر کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اصطلاحات کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ دو جمع دو چار کی طرح ان کا معنی نہیں ہوتا۔ اصطلاحات، خواہ ان کا تعلق کسی شعبۂ علم سے ہو، اپنے اندر معنی و مفہوم کی ایک وسیع دنیا سمیٹے رکھتی ہیں۔ اصطلاح کا مفہوم محض اس کے لغوی معنی تک محدود نہیں ہوتا۔ بلکہ بعض اوقات ایک اصطلاح کا اس کے لغوی معنی سے سرے سے کوئی تعلق ہی نہیں ہوتا۔ ایک اصطلاح کے معنی میں وہ تاریخی پس منظر بھی شامل ہوتا ہے جس تناظر میں وہ وضع کی گئی تھی۔ سیاسیات، معاشیات اور سماجیات کی اصطلاحوں کا معاملہ اور بھی پیچیدہ ہوتا ہے۔ ان کے مفہوم میں تاریخی تناظر کے علاوہ سماجی پس منظر کا دخل بھی ہوتا ہے۔ یعنی یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ کس سماج میں وہ اصطلاح معرض وجود میں آئی تھی۔ اس کے وجود پذیر ہونے کے اسباب وعلل تلاش کرنے پڑتے ہیں۔ ان سب کی رعایت کے بعد ہی اس کا ٹھیک اور صحیح معنی ومفہوم طئے کیا جاتا ہے۔ پھر ہر زبان کی اپنی مخصوص روایات بھی ہوتی ہیں جو ہمیشہ اس زبان کے بولنے والوں کے تاریخی احوال اور سماجی کوائف سے ہم آہنگ رہتی ہیں۔ مختصراً آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایک اصطلاح اپنے دامن میں ایک پورا نظام معنی (Meaning System) رکھتی ہے۔ جس کا مفہوم اس کے تاریخی وسماجی تناظر کی روشنی میں ہی طئے ہوتا ہے۔ مترجم کی نگاہ اگر کسی اصطلاح کے ظاہری ولغوی معنی تک ہی محدود ہو اور وہ اس کے تاریخی وسماجی تناظر سے صرف نظر کر بیٹھے اور محض ظاہری معنی کا اپنی زبان میں ترجمہ کردے تو یہ ترجمہ نہ صرف یہ کہ درست نہ ہوگا بلکہ اس اصطلاح کے ساتھ زیادتی بھی ہوگی۔

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک زبان کی اصطلاح کا تعلق اس زبان سے وابستہ مخصوص فکر اور مخصوص فلسفے سے ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں اس کا صحیح اور مکمل مفہوم صرف اسی زبان میں ادا ہو سکتا ہے۔ جب آپ اس قسم کی کسی اصطلاح کا ترجمہ کسی ایسی زبان میں کرنا چاہتے ہیں جس زبان کا تعلق اُس مخصوص فکر وفلسفے سے نہیں ہوتا، تو آپ کو کوئی ایسا لفظ میسر نہیں آتا جس میں اصطلاح کا صحیح اور مکمل مفہوم ادا ہو جائے۔

اس لئے کبھی کبھی مناسب اور احتیاط کا تقاضہ یہ ہوتا ہے کہ اہم اصطلاحوں کا ترجمہ کرنے کے بجائے انہیں جوں کا توں ہی منتقل کر لیا جائے۔ اس میں قباحت کا کوئی پہلو نہیں۔ یہ زبان کے فقر کی نہیں بلکہ کشادہ قلبی کی دلیل ہوتی ہے۔ پھر یہ کہ ایسا کرنے سے ایک پوری آبادی اجتماعی کنفیوژن میں مبتلا ہونے سے محفوظ رہتی ہے۔

ڈیموکریسی اسی قسم کی، جس کی مختصر تفصیل اوپر پیش کی گئی ہے، ایک انگریزی اصطلاح ہے۔ اس اصطلاح کے ساتھ بھی تاریخی و سماجی فکری وتہذیبی تناظرات اور لسانی روایات وابستہ ہیں۔ اس لئے اس کا کسی زبان میں ایسا ترجمہ کرنا کہ اصل مفہوم کامل صورت میں ادا ہو جائے، بہت مشکل عمل ہے۔ بعض زبانوں کے لئے، ان کے اپنے لسانی اسٹرکچر کی وجہ سے یہ آسان بھی ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر ہندی زبان میں اس کا ترجمہ لوک تنتر (Lok Tantra) کیا گیا ہے۔ یہ ایک مناسب ترجمہ ہے۔ البتہ عربی، فارسی، ترکی اور اردو زبانوں کے لئے یہ ترجمہ دشوار رہا ہے۔ عربی میں اسے انگریزی سے براہ راست منتقل کر لیا گیا ہے۔ چنانچہ عربی زبان میں مذہبی وغیر مذہبی دونوں لٹریچر میں ڈیموکریسی کے لئے لفظ ''دیمقراطیۃ'' ہی مستعمل ہے۔ جو کہ ڈیموکریسی کی تعریب ہے۔ بہتر ہوتا کہ دوسری زبانیں بھی عربی ہی کی تقلید کرتیں۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ ترکی اور فارسی میں اس کا ترجمہ جمہوریت کر دیا گیا۔ یہیں سے یہ اصطلاح اردو میں بھی در آئی اور رائج ہوگئی۔ اردو میں سب سے پہلے یہ ترجمہ کس نے اور کب اختیار کیا اس سلسلے میں کوئی بات بہت وثوق کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی۔ میرے مطالعے کی حد تک علامہ شبلی نعمانیؒ ان لوگوں میں شامل ہیں جنہوں نے اول اول اس ترجمہ کو اختیار کیا ہے۔ علامہ شبلی اپنی شہرہ آفاق تصنیف الفاروق میں جمہوری حکومت اور جمہوریت وغیرہ اصطلاحوں کا استعمال کرتے ہیں۔ شبلی کے علاوہ شاعر اسلام علامہ اقبالؒ نے بھی اپنے اشعار میں اور تجدید فکریات اسلام (Reconstruction of Religious Thought in Islam) میں لفظ جمہوریت استعمال کیا ہے۔ ان کے علاوہ بیسویں صدی کے تمام معروف مسلم علماء اور مفکرین نے ڈیموکریسی کے لئے لفظ جمہوریت ہی استعمال کیا ہے۔ ان میں برصغیر میں مولانا ابوالکلام آزادؒ اور سید ابوالاعلی مودودیؒ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

بعض اہل دانش ڈیموکریسی کا ترجمہ جمہوریت کر دینے پر اپنے تحفظات کا اظہار کرتے رہے ہیں۔ لیکن اس جانب شاید حسب ضرورت توجہ کم ہی دی گئی ہے۔ اگر چہ کہ لفظ جمہوریت اردو داں حلقے میں قبول عام حاصل کر چکا ہے۔ اس کا ایک عرفی معنی بھی طئے ہو چکا ہے تاہم اس ترجمہ کے سلسلے میں عدم اطمینانی کی کیفیت بدستور موجود ہے۔ حالیہ دنوں میں جب کہ مسلم حلقوں میں ڈیموکریسی پر گفتگو کا ایک نیا دور شروع ہوا ہے، اور لوگ ڈیموکریسی اور مغربی ڈیموکریسی کی بحثوں کو خلط ملط کر رہے ہیں، لفظ جمہوریت کے تئیں عدم اطمینانی میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ ڈیموکریسی کے تئیں جو سطحی قسم کی غلط فہمیاں اس وقت مسلم اہل علم اور غیر اہل علم طبقے کے ذہنوں میں گھر کر گئی ہیں ان کے اہم اسباب میں سے ایک ڈیموکریسی کا ترجمہ جمہوریت بھی ہے۔ اگر اس ترجمہ پر از سر نو غور کر کے اسے بحث وگفتگو کا موضوع بنایا جائے تو اس میں کوئی مضایقہ نہیں ہے۔

اردو میں لفظ جمہوریت استعمال کرنے سے لوگوں کے ذہن میں یہ معنی پیدا ہوتا ہے کہ ڈیموکریسی حکومت جمہور کا نام ہے۔ جمہور کے معنی اکثریت (majority) کے ہوتے ہیں۔ حالانکہ ڈیموکریسی کا معنی جمہور کی حکومت نہیں ہے۔ اس کے معنی عوام کی حکومت یا لوگوں کے اقتدار کے ہیں۔ جیسا کہ پچھلے صفحات میں اس کی لغوی تحقیق کرتے ہوئے واضح کیا جا چکا ہے۔ حکومت جمہور اور حکومت عوام میں فی الواقع بڑا فرق ہے۔ کسی ملک میں اگر ملک کے تمام باشندوں کو بلا کسی تفریق ووٹ دینے کا حق حاصل ہو، ووٹ کے ذریعے ہر فرد حکومت سازی کے عمل میں شریک ہو سکتا ہو تو اسے عوامی حکومت یا عوام کا اقتدار ہی کہا جائے گا، جمہور کا اقتدار یا اکثریت کی حکومت نہیں۔ اکثریت کی حکومت دراصل ڈیموکریسی کی ایک ناگزیر عملی صورت (Inevitable Pragmatic Form) ہے۔ لیکن یہی اصل ڈیموکریسی نہیں ہے۔ ڈیموکریسی میں اکثریت کی حکومت ایک الگ موضوع گفتگو ہے۔ یہاں اس پر گفتگو کرنے کا موقع نہیں ہے۔ یہ اس ترجمہ کا پہلا نقص ہے۔

دوسرا نقص ڈیموکریسی کا ترجمہ جمہوریت کر دینے کا یہ ہے کہ لفظ جمہوریت ڈیموکریسی کو ایک باقاعدہ نظریہ بنا دیتا ہے۔ حالانکہ یہ ایک مسلم حقیقت ہے کہ ڈیموکریسی معروف معنوں میں کوئی نظریہ نہیں ہے۔

جمہوریت کا اصل مشتق جمہور ہے۔ جب جمہور کو جمہوریت میں تبدیل کر دیا جاتا ہے تو اس میں ایک شدت اور نظریہ کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی بناء پر لوگ سمجھنے لگتے ہیں کہ جمہوریت ایک نظریہ ہے، حاکمیت جمہور جس کی اساس ہے۔ یہ حاکمیت، عوام کی مطلق حاکمیت پر دلالت کرتی ہے۔ حالانکہ کہ اصل صورت حال اس سے مختلف ہے۔ جب آپ انگریزی میں ڈیموکریسی کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو اس سے کسی نظریہ یعنی کسی اِزم کا مفہوم پیدا نہیں ہوتا۔ پھر حاکمیت کا مفہوم تو اس میں ہے ہی نہیں۔ اس میں صرف حکومت اور آمریا بادشاہ کے مقابلے میں عوام کی خود مختاری کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ پھر اس میں عوام کی مطلق حاکمیت کا معنی نکال لانا ستم بالائے ستم ہے۔ یہ معنی دراصل ڈیموکریسی کا مطالعہ کرنے والوں کے pre-conceived notions کی اختراع ہے۔

عوام کی حاکمیتِ مطلق اصل ڈیموکریسی نہیں ہے بلکہ یہ ڈیموکریسی کا مغربی تصور ہے۔ اہل مغرب چونکہ پہلے ہی اپنے اجتماعی معاملات سے خدا اور اس کی خدائی کو بے دخل کر چکے تھے، لہذا ان کے یہاں یہ سوال پیدا نہیں ہوا کہ حکومت میں خدا کا رول کیا اور کتنا ہوگا۔ خدا کے انکار کے بعد عوام ہی کی خدائی ہو سکتی تھی۔ اس لئے وہاں کی جمہوریت میں حاکمیت عوام کا نظریہ رائج ہو گیا۔ اس کی مزید تفصیلات آئندہ آئیں گی۔

جمہوریت کی اصطلاح کا تیسرا، اور میری نظر میں سب سے اہم نقص یہ ہے کہ یہ ڈیموکریسی کی جملہ ابعاد کو cover نہیں کرتی۔ جمہوریت کا آپ جو بھی معنی لیں عوام کی حکومت یا عوام کی حاکمیت دونوں کا تعلق بہر حال سماج کے سیاسی امور سے ہے۔ یعنی جمہوریت کا ترجمہ ڈیموکریسی کے صرف اس معنی کی ترسیل کرتا ہے جس کا تعلق انتخابی سیاست (Electoral Politics) سے ہے۔ جبکہ ڈیموکریسی اپنے تاریخی سفر سے گذرنے کے بعد اب محض ایک سیاسی اصطلاح نہیں رہ گئی ہے۔ ڈیموکریسی اب ایک سماجی قدر اور انسانی رویہ (behaviour) بن چکی ہے۔ آج کے تناظر میں جب ہم ڈیموکریسی لکھتے یا بولتے ہیں تو اس سے محض مسائل حکومت و حاکمیت مراد نہیں ہوتا بلکہ آزادی، کشادہ نظری، پر امن بقائے باہم، اختلاف رائے اور اظہار رائے کا حق، اخوت و مساوات، عدل و انصاف، اور بھی بہت کچھ معنی اس میں شامل ہوتا ہے۔ لیکن جمہوریت کی اصطلاح کا نقص یہ ہے کہ یہ محض حکومت اور طرز حکومت سے متعلق مسائل ہی کی نمائندگی کرتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ڈیموکریسی کا ترجمہ جمہوریت کر دینے سے خاص طور پر اسلام پسند حلقوں میں بڑے فکری مخمصے پیدا ہو گئے ہیں۔ اسی اصطلاح کی بنیاد پر لوگوں نے یہ قیاس کر لیا کہ جمہوریت ایک غیر اسلامی نظریہ اور 'طاغوتی نظام ہے۔ کیوں کہ جمہوریت کا معنی جمہور کی حکومت یعنی حاکمیت جمہور ہوتا ہے۔ اور اسلام میں حاکمیت صرف اللہ کے لئے خاص ہے۔ اس فکری کنفیوژن کا شکار ہونے سے جلیل القدر اصحاب فکر بھی محفوظ نہیں رہ سکے۔

حقیقت یہ ہے کہ ڈیموکریسی کا ترجمہ جمہوریت کر دینے سے خاص طور پر اسلام پسند حلقوں میں بڑے فکری مخمصے پیدا ہو گئے ہیں۔ اسی اصطلاح کی بنیاد پر لوگوں نے یہ قیاس کر لیا کہ جمہوریت ایک غیر اسلامی نظریہ اور طاغوتی نظام ہے۔ کیوں کہ جمہوریت کا معنی جمہور کی حکومت یعنی حاکمیت جمہور ہوتا ہے۔ اور اسلام میں حاکمیت صرف اللہ کے لئے خاص ہے۔ اس فکری کنفیوژن کا شکار ہونے سے جلیل القدر اصحاب فکر بھی محفوظ نہیں رہ سکے۔ گزشتہ صدی کے ایک جید عالم دین کے درج ذیل خیالات اسی کنفیوژن کے غماز ہیں؛

''تاریکی اور روشنی میں، رات اور دن میں، بدی اور نیکی میں جو فرق ہے وہی جمہوریت اور اسلام میں ہے۔ آپ فلسفہ کی رو سے بھی غور کر لیں۔ آپ جمہوریت کی تعریف کریں۔ عوام کی حکومت، عوام کے لئے، عوام کے ذریعہ سے، عوام کی بہبود کے لئے، یہی تعریف ہے آپ کسی جگہ پڑھ لیجئے۔ اسلام میں اللہ کی حاکمیت، اللہ کی حکومت، اللہ کے قانون کے ذریعہ سے، اللہ کے ماننے والوں کے لئے، موٹی سی یہ تعریف ہے، کہیں پڑھ لیں۔ اب ان دونوں میں ذرا جوڑ ملائیے۔ ہے کوئی جوڑ ملتا ہوا، کوئی تک ہے؟''

اس قسم کے بودے خیالات ڈیموکریسی اور مغربی ڈیموکریسی کے درمیان فرق نہ کرنے کا لازمی نتیجہ ہیں۔ فرق کیوں نہیں کیا گیا؟ اس کی وجہ یہی ہے کہ لوگوں نے ڈیموکریسی کو جمہوریت کہہ کر اس اصطلاح کو عوام کی مطلق حاکمیت کا مترادف بنا لیا۔

کوئی شخص یہ اعتراض کر سکتا ہے کہ ڈیموکریسی کا مفہوم کچھ بھی ہو، اور جمہوریت اس کا ناقص ترجمہ ہی صحیح لیکن اب یہ اصطلاح لوگوں کے درمیان ایک مخصوص معنی میں فروغ پا چکی ہے، لہذا اب ازسرنو لغوی ادھیڑ بن سے کیا حاصل؟ لیکن میرا خیال یہ ہے کہ اگر ہم محسوس کرتے ہیں کہ یہ ترجمہ ناقص ہے، اور اس نے لوگوں کو بڑے تاریخی مغالطے میں ڈال رکھا ہے، تو اس پر ازسرنو غور کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اہل علم حلقے میں اس پر کم از کم مباحثہ تو ضرور ہونا چاہئے۔ رہی یہ بات کہ اس سے کوئی فائدہ حاصل ہوا یا نہیں؟ تو یہ تو بہر حال ڈسکشن کے بعد ہی معلوم ہوگا۔

ڈیموکریسی اور جدید جمہوریت

عوام کی حکومت، عوام کے ذریعے، عوام کے لئے۔ ڈیموکریسی کی تاریخ ابراہم لنکن کی اس تعریف سے شروع نہیں ہوتی۔ یہ جدید ڈیموکریسی کی تعریف ہے۔ جس

کی تاریخ، ایسا کہا جاتا ہے، یورپ کے نشاۃ ثانیہ کے بعد سے شروع ہوتی ہے۔
ڈیموکریسی کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی انسان کے سیاسی افکار وخیالات کی تاریخ۔ قدیم یونانی مفکرین نے ڈیموکریسی کو یونان کی city-states (شہری-ریاستیں) کے تناظر میں ڈیفائن کیا ہے۔ اس حوالے سے کہا جا سکتا ہے کہ ڈیموکریسی کی تاریخ کم از کم دو ہزار سال پرانی ہے۔ یونان کے شہری ریاستوں میں بادشاہت اور امیر طبقے کی حکومت کا نظام رائج تھا۔ قدیم یونان اور مملکت روم کی سیاسی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان علاقوں میں جمہوری طرز حکومت کا آغاز پانچویں صدی قبل مسیح میں ہو چکا تھا۔ یہ افلاطون اور ارسطو کا عہد حیات تھا۔ اس زمانے میں عوام بادشاہ کی مرضی کے آگے سر تسلیم خم کرنے کے پابند ہوا کرتے تھے۔ سیاسی فکر میں بالیدگی آنے کے بعد رفتہ رفتہ عوام کے ذہن میں طرز حکومت کے نئے تصورات جنم لینے لگے۔ عوامی ذہن ایک ایسے سیاسی نظام تک رسائی حاصل کرنے لگا تھا جہاں عوام کو سیاسی امور میں براہ راست مداخلت کرنے کا حق ہو۔ یونان میں اس وقت city-states کا نظام تھا۔ ایتھینز (Ethens) اس کی نمایاں مثال ہے۔ حکومت میں عوامی شرکت کے نئے سیاسی خیال کے پختہ ہونے کے بعد ان شہری ریاستوں میں چیدہ افراد کو citizen (شہری) کا درجہ عطا کیا جانے لگا۔ یہ شہری، ریاست کے سیاسی امور میں عوام کی نمائندگی کرتے تھے۔ اگر ڈیموکریسی کی مختلف اقسام کے حوالے سے دیکھیں تو یہ بلا واسطہ قسم کی ڈیموکریسی (Indirect Democracy) تھی۔ جس میں لوگ براہ راست سیاسی امور میں مداخلت کر سکتے تھے۔ کیوں کہ شہری-ریاستوں کا رقبہ انتہائی کم ہوتا تھا۔ چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے سبب تمام عوام کو ایک جگہ جمع کر کے ان سے رائے لینا ممکن ہوا کرتا تھا۔
قدیم زمانے میں یونان کے علاوہ روم میں بھی ایک عرصے تک عوامی شمولیت والا طرز حکومت پایا جاتا تھا۔ لیکن ڈکٹیٹر جولیس قیصر (Julius Caesar) کے برسر اقتدار آنے کے بعد روم میں پھر بادشاہی نظام چل پڑا۔
عہد حاضر کے معروف ماہر سیاسیات رابرٹ اے ڈائل اس حوالے سے لکھتے ہیں:
''پانچویں صدی قبل مسیح کے نصف اول میں اہل یونان اور اہل روم کے سیاسی تصورات اور اداروں میں ایک تغیر رونما ہوا۔ جسے پہیے کی ایجاد یا نئی دنیا کی دریافت کے حوالے سے ایک تاریخی اہمیت حاصل تھی۔ اس تبدیلی نے دنیا کی تفہیم نو اور اس میں پوشیدہ امکانات کو ظاہر کیا۔ ہوا یہ تھا کہ مختلف شہری ریاستیں (City-States)، جو عہد نا معلوم سے غیر جمہوری حکمرانوں کے زیر اقتدار تھے ایک ایسے نظام میں تبدیل ہو گئے تھے جس میں آزاد، بالغ مردوں کی ایک معتد بہ تعداد کو اس طور پر شہری قرار دیا گیا تھا کہ وہ حکومت میں براہ راست شرکت کر سکیں۔
اس تجربے اور اس سے جڑے خیالات سے ایک نئے ممکنہ نظم سیاسی کا تصور سامنے آیا۔ ایک ایسا نظم جس میں نا صرف یہ کہ خود مختار عوام کو حکومت کرنے کا حق بلکہ اس کے لئے تمام ضروری وسائل اور اداروں کو اپنے زیر تصرف رکھنے کا حق بھی حاصل ہو۔''
(Dahl. Robert A,Democracy and Its Critics)
اس نئے تجربے کے ذریعے عوام پر ایک فرد یا ایک خاندان کی حکومت کا جزوی اور وقتی طور پر خاتمہ ہو گیا۔ اسی طرز حکومت کو اہل یونان نے ڈیموکریشیا (عوام کا اقتدار) کے نام سے موسوم کیا۔ واضح رہے یہ ڈیموکریسی کوئی آئیڈیل طرز حکومت اور نقائص سے مبرا نہیں تھی۔ خود افلاطون اور ارسطو اس کے ناقد تھے۔ البتہ ارسطو نے محدود ڈیموکریسی کی وکالت کی تھی۔ افلاطون اور ارسطو نے مختلف طرز ہائے حکومت کا تقابلی مطالعہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ موجودہ ڈیموکریسی مناسب ترین طرز حکومت نہیں ہے۔ کیوں کہ اس میں گنے چنے افراد ہی کو شہری کا درجہ دیا جاتا تھا۔ یہ درجہ صرف مردوں کے لئے خاص تھا۔ خواتین، مہاجرین اور غلاموں کو اس حق سے محروم رکھا جاتا تھا۔ یعنی محض 10 فیصد افراد ہی شہری کا درجہ رکھتے تھے۔ یہی عوام پر حکومت کرتے تھے۔ لیکن ان سب کے باوجود یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ ڈیموکریسی کی ابتدا یہیں سے ہوئی۔ اور اسی بنیاد پر کہا جاتا ہے کہ ڈیموکریسی کی تاریخ دو ہزار سال سے زیادہ قدیم ہے۔
یہ ڈیموکریسی کی مختصر تاریخ ہے۔ جدید ڈیموکریسی کا تصور سولہویں صدی عیسوی میں سامنے آیا۔ یورپ کے نشاۃ ثانیہ اور اصلاح مذہب کی تحریکوں کے نتیجے میں مختلف تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ انسانی زندگی کے ہر سوال اور ہر گوشے پر از سر نو غور کرنے کا رجحان پیدا ہوا۔ روایتی سیاسی، سماجی و معاشی فکر و فلسفے میں اصولی نوعیت کی تبدیلی آ گئی۔ نئے فکر و فلسفے کی بنیاد فرد کو بنایا گیا۔ اس کے نتیجے میں نئی اخلاقی اقدار، بنیادی حقوق اور آزادی کے تصورات سامنے آئے۔ 1688 میں انقلاب انگلستان کے موقع پر جان لاک نے اس خیال کا اظہار کیا کہ انسان کے کچھ فطری اور بنیادی حقوق ہوتے ہیں، جنھیں کوئی اس سے چھین نہیں سکتا۔ اس میں زندگی، آزادی اور ملکیت کا حق شامل ہے۔ ریاست کی تشکیل دراصل ان ہی حقوق کی حفاظت اور نگرانی کے لئے کی جاتی ہے۔ اٹھارویں صدی میں امریکہ کی آزادی (1776) اور انقلاب فرانس (1789) جدید ڈیموکریسی کے ارتقا کا ایک اہم مرحلہ تھا۔ انیسویں صدی میں یرمی بنتھم اور جان اسٹیورٹ مل نے نظریہ افادہ پسندی (Utilitarianism) کی بنیاد پر ڈیموکریسی کی وکالت کی۔
جدید ڈیموکریسی کا یہ مختصر پس منظر ہے۔ اس کی مزید تفصیل آئندہ صفحات میں پیش کی جائے گی۔ یہاں مقصود صرف یہ بتانا تھا کہ ڈیموکریسی کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ اور اس وقت جو جمہوری طرز حکومت دنیا بھر میں رائج ہے وہ جدید ڈیموکریسی ہے۔ اس وقت جدید ڈیموکریسی ہی موضوع گفتگو ہے۔ (جاری)

کیمپس میں کام کرنے کے طریقے

قسط نمبر (۵)

امین عثمانی

یونیورسٹی میں غیر مسلم طلبا اور طالبات قومی اور وطنی محبت کے اظہار کے لیے ۲۶/جنوری کے دن کی مناسبت سے ہندوستانی جمہوریت کی تعریف وتحسین کرنے کے لیے اور یونیورسٹی میں نیشنلسٹ گروپ کی حیثیت سے نمایاں ہونے کے لیے ایک سبھا کا آیوجن کرنے پر وچار کر رہے تھے، کینٹین کے لان میں بہت سے غیر مسلم طلبا اور طالبات جو الگ الگ فیکلٹی کے تھے سب ایک ساتھ بیٹھ کر اس ایشو پر وچار کر رہے تھے، ادھر سے حامد کا دوست جنید گزرا، ان طلبا نے اسے بھی اپنے پاس بلالیا اور اس سے کہا کہ اس پروگرام میں تم کیا سہایتا کروگے۔ جنید نے کہا ارے تم انڈین ڈیموکریسی کی اچھائیاں بیان کرنے کے لیے یہ پروگرام کر رہے ہو، کیا تم دیکھتے نہیں اس ڈیموکریسی کا کیا حال ہے، پارلیمنٹ اور اسمبلی میں کیسے کیسے مجرم پہنچتے ہیں، الیکشن میں کیسی کیسی دھاندلی ہوتی ہے اور کانسٹی ٹیوشن کو کیسے نظر انداز کیا جاتا ہے، یہ کیسی جمہوریت ہے جس کے لیے تم پروگرام کرنا چاہتے ہو، تم کو تو الیکٹورل ریفارم پر پروگرام کرنا چاہئے، خیر کچھ کرنا ہی چاہتے ہو تو اس میں ہم بھی رہیں گے، دیکھیں گے۔ اس پر ریمش نے جواب دیا کہ انڈین ڈیموکریسی دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہے اور اس میں سارے بھارتیہ مل کر بھاگ (حصّہ) لیتے ہیں اور اپنے اپنے علاقوں سے اپنا نمائندہ چن کر پارلیمنٹ یا اسمبلی میں بھیجتے ہیں، تم کو آخر اس سسٹم سے کیا پریشانی ہے۔ ابھی بات چل ہی رہی تھی، لڑکے لڑکیاں چائے پی رہے تھے، قہقہے بھی گونج رہے تھے، کچھ کھڑے تھے، کچھ بیٹھے تھے، کچھ آدھے لیٹے تھے کہ اتنے میں حامد اپنے دو تین فرینڈ کے ساتھ وہاں پہنچ گیا، اصل تو وہ چائے پینے کے لیے گیا تھا لیکن دیکھا کہ طلباء اکٹھا بیٹھے باتیں کر رہے ہیں اور جنید بھی ان میں ہے تو وہ بھی بیٹھ گیا، تب پتہ چلا کہ ایک پروگرام ہونے والا ہے جسے غیر مسلم طلبا خاص طور سے کرنا چاہتے ہیں۔ موقع کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے حامد نے کہا کہ بالکل بالکل یہ پروگرام ضرور ہونا چاہئے اور اسے آرٹ فیکلٹی کے ہال میں کیا جائے تو اور اچھا ہے، جس میں وی سی صاحب بھی ہوں گے اور سارے ٹیچرس بھی ہوں گے، تو اس میں مجھے بھی بولنے کی انومتی دیدو تاکہ میں بھی اپنے وچار رکھ سکوں۔ اس پر اتفاق ہوگیا، تھرسڈے میں یعنی ۲۵/جنوری کو یہ پروگرام وہاں ہوا جہاں طلبا اور طالبات کی اچھی خاصی حاضری تھی، اساتذہ بھی موجود تھے، وائس چانسلر بھی اسٹیج پر براجمان تھے، یونیورسٹی کے ترانہ سے پروگرام کی شروعات ہوئی، اس کے بعد اسٹوڈنٹس یونین کے پریسیڈنٹ پرکاش راوت نے ہندوستان اور ہندوستان کی آزادی اور پھر اس کے کانسٹی ٹیوشن، ڈیموکریسی، سوشلزم، سیکولرزم کے بارے میں کچھ باتیں کہیں اور بتایا کہ بھارتی اتہاس اور تاریخ میں اس کی اہمیت اور مہتو کو دیکھتے ہوئے اس پروگرام کا آیوجن کیا گیا ہے۔ اس کے بعد قومی ترانہ میوزک کے ساتھ گایا گیا اور تمام اسٹوڈنٹس نے اس میں ساتھ دیا، پھر سب سے پہلے اسٹوڈنٹس یونین کے صدر نے ایک خاتون پروفیسر للیتا سے گزارش کی کہ وہ اتہاس کی روشنی میں کچھ بتائیں، ان کی اسپیچ کے بعد جو ہندی اور انگریزی میں ملی جلی تھی اسٹوڈنٹس یونین نے حامد کو بولنے کے لیے چند منٹ کا ٹائم دیا۔ حامد نے برطانوی سامراج سے ہندوستان کی جنگ آزادی کا ذکر کرتے ہوئے مسلمانوں کی آزادی میں قربانی اور حصہ کو بتایا، اور پھر بتایا کہ آزاد ہندوستان میں جو ڈیموکریسی کی بنیاد پر قائم ہے اگر صحیح طریقہ پر سیکولرزم کو نہیں برتا گیا اور دستور کی روح کا لحاظ نہیں کیا گیا تو پھر ملک میں تعصب، تنگ نظری، نفرت اور فرقہ واریت کے رجحانات بڑھیں گے۔ اس لیے دستور کا لحاظ رکھنا چاہئے، ساتھ ہی حامد نے یہ بات بھی کہی کہ سب سے اچھی جمہوریت یا سب سے اچھا سیاسی نظام اگر کسی مذہب کے پاس ہے تو وہ اسلام ہے جس کی بنیاد ہی عدل، مساوات، اخوت، رواداری اور خدمت پر قائم ہے، اگر حقوق کا پاس ولحاظ نہ کیا جائے اور آدمیت کا احترام نہ ہو تو پھر کچھ بھی نہیں ہوسکتا۔ حامد کی تقریر وقت سے جیسے ہی آگے بڑھنے لگی اسٹوڈنٹس کے صدر نے ان کو تقریر ختم کرنے کے لیے کہا اور پھر وی سی صاحب کو بھاشن کے لیے موقع دیا گیا، وائس چانسلر نے بہت ہی زور کے ساتھ یہ بات کہی کہ کسی بھی یونیورسٹی کے اسٹوڈنٹس کے لیے ضروری ہے کہ وہ غیر جانبدار ہو کر مطالعہ کریں اور ہر چیز کی خوبی اور خامی کو جانچنے اور پرکھنے کی کوشش کیا کریں، مگر یہ جانچنے کا کام اعلیٰ اصول اور معیار کے تحت ہونا چاہئے، پسند اور ناپسند کے لحاظ سے نہیں، وی سی نے کہا کہ اگر کسی سیاسی نظام میں کوئی چیز بہتر ہے تو اس کو دیکھنا چاہئے اور پڑھنا چاہئے، خواہ وہ نظام کسی کا بھی ہو اور کسی کی طرف سے بھی آرہا ہو۔

حامد نے اس موقع کے لیے ایک مضمون ہندی میں لکھا تھا جو بہت مختصر تھا اور تھوڑی ہی تعداد میں تھا اسے اس نے کا پیاں کرا کر اس سبھا میں تقسیم کر دیا۔ اپنے مضمون کے آخر میں حامد نے دنیا کے موجودہ سیاسی نظاموں سے متعلق سوالات اٹھائے، جو سوالات بہت اہم اور فکری تھے اور جو غور و فکر کی دعوت دے رہے تھے۔ پروگرام ختم ہوا اور اسٹوڈنٹس واپس جوق در جوق نکلنے لگے حامد نے بھی اپنے ہاسٹل کا راستہ لیا تا کہ میس میں کھانا کھا کر پھر بقیہ کام انجام دے۔

کھانے کی میز پر اس کے ساتھ یونیورسٹی کے دو تین غیر مسلم اسٹوڈنٹس آ کر بیٹھ گئے اور یہ پوچھنے لگے کہ اسلام دھرم میں ناری کے کیا حقوق ہیں؟ میں نے سنا ہے کہ اسلام دھرم میں عورتوں کو مسجد میں جانے اور نماز پڑھنے کی پرمیشن نہیں ہے، میں نے یہ بھی سنا ہے کہ اس میں پُرش اور ناری کے بیچ میں برابری کے ادھیکار نہیں ہیں۔ پتی کو طلاق دینے کا رائٹ ہے لیکن پتنی کو نہیں ہے، پتی کو پیسے کمانے کا ادھیکار ہے لیکن پتنی کو نہیں، میں نے یہ بھی سنا ہے کہ اگر کسی مسلمان گھر میں لڑکے اور لڑکیاں ہوتی ہیں تو لڑکوں کو زیادہ چاہا جاتا ہے اور لڑکیوں کو دبا کر رکھا جاتا ہے، لڑکیوں کو جاب کرنے کا ادھیکار نہیں ہے، ایک ہی سانس میں راج کمار نے یہ ساری باتیں کہہ ڈالیں اور ساتھ بیٹھے بقیہ ہندو طلبا بھی سوالیہ نظروں سے حامد کی طرف دیکھنے لگے۔

سبھاش نے کہا کہ میں بھی اگر تم کہو تو کچھ پوچھوں، حامد نے کہا کہ ہاں کیوں نہیں، اس نے پوچھا اچھا یہ بتاؤ کہ اللہ نے ادھیک تر مسینجر عرب ہی میں کیوں بھیجے، بھارت میں کیوں نہیں بھیجے، جبکہ بھارت پراچین کال سے ایک بہت اولڈ سیویلائزیشن کی حیثیت سے دنیا بھر میں جانا جاتا ہے۔

حامد نے کہا کہ جہاں تک اسلام دھرم میں ناری کی پوزیشن یا پتنی اور بیٹی کی پوزیشن کی بات ہے تو سب کے ادھیکار کئی اعتبار سے برابر ہیں، البتہ ڈیوٹی سب کی کچھ الگ الگ ہے، میرج میں ادھیکار برابر ہے، پوجا (عبادت) میں ادھیکار برابر ہے، جاب کرنے اور پیسہ کمانے کا بھی ناری کو ادھیکار حاصل ہے۔ بات یہ ہے کہ اس کا کام بڑا ہے اور اسی کام کے لحاظ سے اس کو پوزیشن دی گئی ہے، ناری کا کام ایک انسان کو بنانا ہے اور زیادہ محنت اس کی اسی پر ہوتی ہے کہ وہ ایک انسان بناتی اور تیار کرتی ہے۔ ماں اپنے بچے کو جیسا چاہے بنا سکتی ہے اور اپنے گھر کو جس رنگ میں چاہے ڈھال سکتی ہے، اس کا بیسک کام گھر کو سنبھالنا ہے اس لیے وہ زیادہ محنت اور محبت کے ساتھ اس کام میں لگتی ہے۔ اپنے پتی سے الگ ہونے کا اس کے پاس بھی ادھیکار ہے، اگر وہ چاہے تو علیحدہ ہونے کے لیے اسلامی قانون کے تحت پتی سے جدا ہو سکتی ہے۔ جہاں تک بات طلاق کی ہے تو طلاق کا ادھیکار مرد کے پاس ہے لیکن وہ اس وقت کے لیے ہے جب نباہ کی کوئی شکل نہ رہے، اور مسجد میں جانے سے منع نہیں ہے، البتہ یہ ضروری ہے کہ مسجد میں آنے جانے اور نماز پڑھنے کے لیے الگ سے سیپریٹ اس کا انتظام ہو تا کہ مردوں سے سامنا نہ ہو، کیونکہ اسلام نے پردے کو بہت اہمیت دی ہے۔ جاب کرنے یا پیسہ کمانے یا بزنس کرنے سے اسلام نے نہیں روکا، البتہ اس کے لیے کچھ کنڈیشن (شرطیں) لگائی ہیں تا کہ عورت ذات مرد کی کسی زیادتی کا کبھی بھی اور کہیں بھی شکار نہ ہو پائے، باقی رہی یہ بات کہ ناری کی اسلام میں پوزیشن کیا ہے، تو ماں ہو، بیٹی ہو، پتنی ہو یا بہن ہو، اسلام نے عورت کے تمام رشتوں کو ان کی حیثیت کے لحاظ سے بڑی عزت دی ہے اور بڑا مقام دیا ہے، اور اگر کوئی اس کا پالن نہ کرے تو وہ سب سے بڑا مورکھ ہے۔ حامد نے کہا کہ اگر تم چاہو تو میں اس پر انگریزی اور ہندی میں کتاب تم کو دے سکتا ہوں جس سے تم کو پتہ چلے گا کہ اسلام میں عورت کے کیا ادھیکار ہیں۔

ہاں تم نے ایک بات شاید یہ بھی کہی تھی کہ ہندوستان میں مسینجر کیوں نہیں آئے؟ تو ایسی بات نہیں ہے، خدا نے ہر قوم میں چاہے وہ دنیا میں کہیں بھی رہ رہی ہو اپنا مسینجر اوش بھیجا ہے، لیکن ہماری کتاب میں یہ لکھا ہے کہ ہم نے بہت سے مسینجر بھیجے اور ہر قوم میں بھیجے، لیکن ہم نے سب کا حال اور نام نہیں بتایا، اس لیے ہم بھی نہیں بتا سکتے کہ یہاں بھارت میں مسینجر آئے یا نہیں، ضرور آئیں ہوں گے، ہم ایک اندازہ ان کی اچھی تعلیمات سے کر سکتے ہیں، مگر بالکل متعین طور سے ہم کسی کو یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ مسینجر (رسول) تھے کہ نہیں، اگر ان کا نام یا ان کا ذکر ہماری کتاب قرآن میں نہیں آیا۔

ابھی یہ بات حامد کر ہی رہا تھا اور کھانا اپنے اختتام کو پہنچ رہا تھا کہ یونیورسٹی میں زیر تعلیم دو مدرسہ بیک گراؤنڈ کے اسٹوڈنٹس حیات خاں اور بشیر وہاں پہنچ گئے، انھوں نے حامد کی باتیں کچھ سنیں لیکن وہ بھی بالکل آخر میں۔ حیات خاں بولے کہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہندو اہل کتاب ہیں، جس طرح عیسائی، یہودی اور مسلمان اہل کتاب ہیں کہ ان کے پاس نبی کتاب لیکر آئے۔ حیات خاں نے یہ بھی کہا کہ ہندوؤں کی قدیم مذہبی کتابوں میں، ان کے اشلوک میں، ان کی پراتھنا میں، ایسی چیزیں موجود ہیں جس سے توحید اور آخرت کا پتہ چلتا ہے، اور اسی طرح اعلیٰ اقدار کے بارے میں بھی بہت سی چیزیں ملتی ہیں۔ ہندوؤں میں بھی دان کا تصور ہے، مانوتا کا تصور ہے، انسانی رواداری کا تصور ہے، صفائی ستھرائی کا تصور ہے، یہ سب چیزیں بتاتی ہیں کہ ان کے یہاں ضرور مسینجر آئے ہوں گے۔ حامد نے کہا کہ مسلم اسکالرس نے کبھی بھی متعین طور پر یہ نہیں کہا کہ ہمارے ہندو بھائی اہل کتاب شمار کئے جا سکتے ہیں، اس لیے یہ میں بھی نہیں کہہ سکتا۔ اب رہی یہ بات کہ ان کے پاس کتاب بھی آئی تھی، ہو سکتا ہے آئی ہو، اس کی شکل بدل گئی ہو یا اب وہ ضائع ہو گئی ہو، اسلام نے اہل کتاب صرف یہودی اور عیسائی فرقہ کو مانا ہے اور صابئین کو بھی اہل کتاب مانا ہے۔ اب رہی یہ بات کہ اخلاقی خوبیاں تو یقیناً مختلف ریفامر کی تعلیمات کی وجہ سے ہو سکتی ہیں۔

حامد نے بولا کہ مجھے کچھ ضروری کام یاد آ گیا، میں اب روم پر جا رہا ہوں، کل پھر بات ہوگی اگر موقع ملا تو۔ میز سے اٹھتے اٹھتے اس نے غیر مسلم طلبا سے یہ ضرور مخاطب ہو کر کہا کہ اسلام دھرم انسانیت سے پریم اور محبت کا دھرم ہے، وہ انسان کو کامیاب بنانا چاہتا ہے، دھرم یہ کہتا ہے کہ اصل کامیاب انسان وہ ہے جو آخرت میں کامیاب ہو جائے اور وہی کامیابی سب سے بڑی کامیابی ہے، اگر انسان اس بڑی کامیابی کے لیے تیار ہوا اور سوچے تو پھر اس کے اندر ایسی انسانیت پیدا ہوگی کہ وہ لینے والا کم اور دینے والا زیادہ ہوگا، اس کے پاس خدا کی دی ہوئی جو چیز ہوگی وہ دوسرے انسانوں کو پہنچائے گا، تقسیم کرے گا، بانٹے گا اور سب کو فائدہ پہنچائے گا، اپنے پیسہ سے، اپنی دولت سے، اپنے آپ سے، اپنے علم سے اور جو کچھ بھی اس کو اللہ نے دیا ہوا اس سے۔ اگر کوئی انسان دوسرے انسانوں کی مدد نہیں کرتا اور ان کو آگے بڑھانے اور ترقی دینے کے لیے محنت نہیں کرتا اور صرف اپنے بارے میں سوچتا ہے تو وہ دنیا کا سب سے خود غرض، بے وقوف انسان ہے۔

ٹھنڈی ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور پھر حامد روم کی طرف تیزی سے لپکا تا کہ نماز ادا کر سکے۔ (جاری)

آر ٹی ای
خصوصیات اور چیلنجز

ڈاکٹر عظمیٰ صدیقی، علیگڑھ

سڈنی جے ہیریس نے کہا تھا کہ تعلیم کا اصل مقصد آئینوں کو کھڑکیوں میں تبدیل کرنا ہے۔ ہمارے ملک میں لاکھوں نوجوان ذہن ہیں جو اپنے خواب وخیالات کے آئینوں کو حقیقت کی کھڑکیوں میں تبدیل کرنا چاہتے ہیں لیکن بدقسمتی سے ہمارے ملک میں غربت اب بھی موجود ہے جو بنیادی تعلیم حاصل کرنے سے بہت سے لوگوں کو روکتی ہے۔ تعلیم کا حق حکومت کی جانب سے لوگوں کو اس معذوری سے نجات دینے اور انہیں بنیادی تعلیم حاصل کرنے کے قابل بنانے کے لئے ایک کوشش ہے تا کہ وہ معاشرے کی خدمت اور اصلاح کے لئے علم حاصل کر سکیں۔ مفت اور لازمی تعلیم ایکٹ (آر ٹی ای) 6 سے 14 سال کی عمر کے ہر بچے کے لئے تعلیم کو ایک بنیادی حق کے طور پر پیش کرتا ہے۔

آر ٹی ای ایکٹ کے عنوان میں مفت اور لازمی الفاظ داخل ہیں۔ مفت تعلیم کا مطلب ہے کہ کوئی بھی بچہ (اس کے علاوہ، جو اپنے والدین کی طرف سے کسی ایسے اسکول میں داخل کرایا گیا ہو، جو حکومت کی طرف سے حمایت کردہ نہیں ہے) کسی بھی قسم کی فیس یا اخراجات ادا کرنے کے لئے ذمہ دار نہیں ہوگا، جو اس کی ابتدائی اور لازمی تعلیم کو پورا کرنے سے روک سکتے ہیں۔ لازمی تعلیم کا مطلب ہے کہ ۶ تا ۱۴ سال کی عمر کے تمام بچوں کے داخلہ، حاضری اور بنیادی تعلیم کو پورا اور یقینی بنانے کی ذمہ داری مقامی انتظامیہ اور حکومت کی ہوگی۔ اس کے ساتھ ہی، ہندوستان نے حق کی بنیاد پر مبنی ڈھانچے کے لئے آگے بڑھ کر اقدامات کئے ہیں جو مرکزی اور ریاستی حکومتوں پر آر ٹی ای قانون کی دفعات کے مطابق آئین کے آرٹیکل 21-A میں موجود اس بنیادی تعلیم کے حق کو لاگو کرنے کے لئے ایک قانونی ذمہ داری رکھتا ہے۔ آر ٹی ای ایکٹ کی اہم خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں:

۱) ۶ تا ۱۴ سال کی عمر کے ہر بچے کو اپنے قریب ترین اسکول میں مفت اور لازمی تعلیم حاصل کرنے کا حق ہے، جب تک کہ اس کی بنیادی تعلیم مکمل نہ ہو جائے۔

۲) نجی اسکولوں کو معاشرے کے کمزور اور پچھڑے طبقے سے ۲۵ فیصد طلبہ کو اپنے اسکولوں میں داخلہ دینا پڑے گا۔ حکومت ان بچوں کی تعلیم کا فنڈ دے گی۔

۳) اس کوٹہ میں کوئی نشست خالی نہیں کی جا سکتی، ان بچوں کو بقیہ تمام بچوں کے برابر ہی مانا جائے گا اور سرکاری جانب سے پوری امداد فراہم کی جائے گی۔

۴) تمام اسکولوں کو اس ایکٹ میں مقرر کردہ معیار اور شرائط کے بارے میں محتاط رہنا پڑے گا اور کوئی بھی اسکول جو ۳ سال کے اندر ان شرائط کو پورا نہیں کرے گا، اسے کام کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ تمام نجی اسکولوں کو رجسٹریشن کرنے کے لئے درخواست داخل کرنا ہوگی، اگر وہ اس کام میں ناکام رہتے ہیں تو ان پر ایک لاکھ روپے کا جرمانہ عائد کیا جائے گا اور اگر وہ کام جاری رکھیں گے تو انہیں ۱۰ ہزار روپے فی دن بطور جرمانہ ادا کرنے ہوں گے۔ استاد کی اہلیت اور ٹریننگ کے قوانین اور معیار بھی ایک تعلیمی اتھارٹی کی طرف سے مقرر کئے جا رہے ہیں۔ تمام اسکولوں میں، اساتذہ کو ۵ سال کے اندر اندر ان قواعد وضوابط کی پابندی کرنا ضروری ہے۔

۵) کسی قسم کے عطیہ یا کسی شخص سے بطور امداد پیسہ لینے کی اجازت نہیں ہوگی۔

۶) بچوں یا والدین کے لئے کوئی داخلہ امتحان یا انٹرویو نہیں ہوگا۔

۷) ابتدائی تعلیم کی تکمیل تک کوئی بچہ اسکول سے نہیں ہٹایا جا سکتا ہے اور اس کے لئے بورڈ کے امتحانات میں پاس ہونا ضروری ہے۔

۸)اس ایکٹ کے نفاذ کی نگرانی کے لئے ایک کمیشن قائم کرنے کی بات بھی کہی گئی ہے۔

۹)طلبہ اور اساتذہ کے درمیان ایک خاص تناسب کو برقرار رکھنا ضروری ہے۔

۱۰) تمام اسکولوں کو ان قوانین اور قواعد وضوابط کی تعمیل کرنی ہوگی، اگر اسکول ناکام ہوتا ہے تو اسکول کو کام کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ان تمام قوانین کو نافذ کرنے کے لئے، تین سالوں کی اخلاقی مدت کو تمام اسکولوں میں بڑھا دیا گیا ہے، جو ان کے لئے ضروری ہے۔

۱۱) اس قانون میں اساتذہ کی ٹریننگ اور قابلیت کے قوانین کو واضح طور پر بیان کیا گیا ہے۔

۱۲) نجی اور غیر امداد یافتہ اسکولوں کے علاوہ تمام اسکولوں کو اسکول مینجمنٹ کمیٹیوں کی طرف سے منظم کیا جاتا ہے، جس میں ۷۵/ فیصد ارکان والدین اور سرپرست ہیں۔ان خصوصیات پر غور کرنے کے بعد یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ آر ٹی ای ایک جادو کی چھڑی

نہیں ہے جو کہ پسماندہ بچوں کو تعلیم فراہم کرنے کے موجودہ مسائل کو اپنے فوری اثرات سے ختم کردے گی۔مسائل اور چیلنجز ابھی بھی موجود ہیں اور وہ کافی بڑے ہیں۔جب آر ٹی ای یعنی تعلیم کا حق ایکٹ منظور کیا گیا تھا، تو یہ اندازہ لگایا گیا تھا کہ کل ۶ء۱۰/لاکھ اساتذہ کو پیشہ ورانہ تربیت یعنی ٹریننگ کی ضرورت ہے، جو ایکٹ کے نفاذ سے زیادہ سے زیادہ پانچ سال کے اندر مکمل کیا جانا تھا، یعنی مارچ ۲۰۱۵ء تک لیکن موجودہ وقت میں، نااہل اساتذہ کی تعداد پارلیمنٹ میں وزیر برائے فروغ انسانی وسائل کے بیان کے مطابق ۱۱/لاکھ ہے۔ترمیم بل کی منظوری کے ساتھ، ان کے اساتذہ کو اب کم از کم قابلیت حاصل کرنے کے لئے مارچ ۲۰۱۹ء تک کا وقت دیا گیا ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ جو مقصد سات سالوں میں حاصل نہیں کیا جاسکا، وہ دو سالوں میں کس طرح حاصل کیا جائے گا؟ اسی طرح ہندوستان میں پرائمری اسکولوں کی خستہ حالی کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ Gross Enrollment Ratio کا لگاتار کم ہونا اور ڈراپ آوٹ طلبہ کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہونا بہتر مستقبل کی نشاندہی نہیں کرتے ہیں۔ورلڈ ڈیولپمنٹ رپورٹ ۲۰۱۷ء کے مطابق ہندوستان نے مالاوی کے بعد ۱۲/ممالک کی فہرست میں دوسرا نمبر درج کیا ہے جہاں درجہ دوم کا طالب علم ایک مختصر متن کا ایک لفظ بھی نہیں پڑھ سکتا۔اسی طرح ہندوستان سات ممالک کی اس فہرست میں سب سے اوپر ہے جہاں درجہ دوم کا طالب علم دو ہندسوں کو گھٹا کر باقی نہیں نکال سکتا۔حال ہی میں پارلیمنٹ میں آر ٹی ای ایکٹ میں ترمیم کرتے ہوئے درجہ ہشتم سے پہلے طلبہ کو فیل کرنے کے راستے بھی کھول دیئے گئے ہیں۔ماہر تعلیم مانتے ہیں کہ اس ترمیم کے بعد Enrollment میں مزید کمی آئے گی۔دیگر مسائل مثلاً اسکولوں سے باہر یعنی اسکولوں سے محروم بچوں کا حساب کس طرح کریں، پسماندہ بچوں کے والدین کا تعلیم یافتہ نہ ہونا، عوام کے درمیان آر ٹی ای کے بارے میں بیداری کی کمی، معیاری اسکولوں کا فقدان، بنیادی سہولیات کی کمی، مالی امداد کی کمی اور تربیت یافتہ اساتذہ کی کمی، نجی اسکولوں اور سرکاری اسکولوں میں دی جانے والی تعلیم میں بڑا فرق، ہندوستان میں آر ٹی ای کے عملدرآمد میں اہم چیلنجز ہیں، جن پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔اس کے علاوہ کورس، نصابی کتابوں، تعلیم کے اخراجات، علاقائی زبانوں میں تعلیم، ایک مناسب استاد اور تربیتی پروگرام جیسے اہم پہلوؤں پر دوبارہ اور سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔آر ٹی ای کے مثبت عمل کے لئے، اس ایکٹ کے تمام بنیادی اعضاء کو صحیح جگہ میں رکھنے کی ضرورت ہے۔ہمارے ملک کے تعلیمی نظام کو بچوں کے تعلیمی حق کے احترام کے لئے خود کو زیادہ آسان بنانے اور تیزی سے کام کرنے ضرورت ہے تاکہ معاشرے کے محروم طبقوں تک تعلیم کی روشنی پہنچ سکے جو انہیں ناخواندگی کی تاریکی سے باہر لے کر آئے اور ایک بہترین معاشرے کی تشکیل ہو۔

ملک کے ایک حصے میں بلٹ ٹرین کو دوڑا دینا ہمارے ملک کو ایک بہترین ملک نہیں بنا سکتا۔ہندوستان ایک بہترین ملک تبھی مانا جائے گا جب اس بلٹ ٹرین تک ہر شخص کی پہنچ ہوگی۔اسی طرح کچھ عالمی معیاری یونیورسٹیاں' تعمیر کر کے ہندوستان کو ایک ترقی یافتہ ملک نہیں بنایا جا سکتا۔ہندوستان ایک ترقی یافتہ ملک تبھی بنے گا جب اس کی پرائمری اور ثانوی تعلیم کا اہتمام عالمی معیار' کا ہوگا۔اگر ہماری بنیاد مضبوط ہوگی، چند مدت میں تینوں سطح کے تعلیمی نظام (پرائمری، ثانوی اور اعلی) میں بھی بہتری آئے گی اور واقعی یہی ترقی کی سمت میں ایک معروف قدم' ثابت ہوگا۔
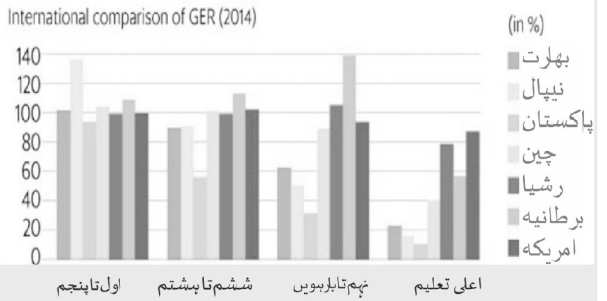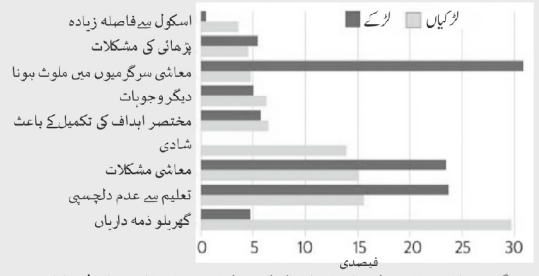
جسٹس بی جی کولسے پاٹل، بامبے ہائی کورٹ کے ریٹائرڈ جج ہیں۔ ۱۹۹۰ء میں بامبے ہائی کورٹ سے ریٹائرمنٹ کے بعد سے مستقل سماجی جدوجہد میں منہمک ہیں۔ فی الحال پونہ، مہاراشٹر میں مقیم، لوک شاشن آندولن نامی عوامی تحریک کے بانی وسربراہ ہیں۔ دائیں بازو کی شدت پسند پارٹیوں کے خلاف، سیکولر جماعتوں کا اتحاد آپ کی تحریک کا خاص مقصد ہے۔
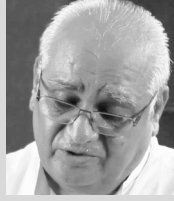
جسٹس پی بی ساونت، سپریم کورٹ کے ریٹائرڈ جج ہیں۔ ۱۹۹۵ء میں ریٹائرمنٹ کے بعد سے حکومتی ناانصافیوں کے خلاف سماجی جدوجہد میں متحرک ہیں۔ گجرات فسادات میں ریاستی حکومت کے رول کے حوالے سے تفتیشی ٹریبونل میں شامل رہے ہیں۔
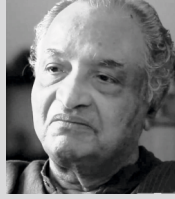
رواں سال کی شروعات میں مہاراشٹر میں پیش آنے والے واقعات کے تناظر میں جسٹس کولسے پاٹل اور جسٹس پی بی ساونت سے یہ انٹرویو قارئین رفیق کے لئے صبور فاروقی نے منعقد کیا۔

سوال: بھیما کورے گاوں میں مہاروں کے دوسو سالہ جشن کے دوران ہوئے تشدد اور اس کے بعد مہاراشٹرا کے مختلف علاقوں میں جو پر تشدد مظاہرے ہوئے، ان کی حیثیت محض واقعاتی عمل اور ردعمل کی ہے، یا ان کا کوئی طویل پس منظر ہے؟

کولسے پاٹل: ان واقعات کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے ان کا تاریخی پس منظر سمجھنا بے حد ضروری ہے۔ ویدک سماج کے سماجی انتشار کو ختم کرنے کے لئے بدھ مت کا تقریباً ڈھائی ہزار سال قبل بھارت میں ظہور ہوا۔ جو ظالم طبقہ کے لئے کم وبیش ہزار سال تک دردِ سر بنا رہا۔ چھٹی صدی عیسوی میں اسلام کی بھارت میں آمد ہوئی، جسے آریہ برہمنوں نے بدھ مت کے اثرات کو ختم کرنے کے لئے استعمال کیا اور منوواد کو فروغ دیا۔ محمد بن قاسم اور اس کے بعد جو حکمران یہاں آئے، ان سے برہمنوں نے تعاون کے بدلے میں ہندو سماج کے مذہبی معاملات میں دخل اندازی نہ کرنے کا قرار باندھا۔ چھترپتی شیواجی وہ پہلا حکمران ہے، جس نے منوسمرتی کے قوانین خاطر میں نہیں لاتے ہوئے، تمام پسماندہ طبقات کے افراد کو بھی حکومت کی ذمہ داریوں میں شامل کیا۔ ڈاکٹر امبیڈکر نے شیواجی کے اس اقدام کو جمہوری طرز قرار دیا ہے۔ برہمنوں کو یہ طرز حکومت بالکل نہیں جچا، لہٰذا انہوں نے شیواجی کی حکومت میں کام کرتے ہوئے بھی ان کے ساتھ دشمنی روا رکھی اور اندرونی طور پر سازشیں کرتے رہے اور افضل خان، دلیر خان جیسے شیواجی کے سیاسی دشمنوں کی ڈھکے چھپے طور پر مدد بھی کی۔ شیواجی کے بعد اس کے بیٹے سمبھاجی نے حکومت سنبھالی، اور چونکہ غیر برہمن ہوتے ہوئے اس نے سنسکرت سیکھی اور سنسکرت میں کام کیا، لہٰذا مغلوں سے شکست اور اس کی موت کے بعد برہمنوں کے کہنے پر منوسمرتی کے ظالم قوانین کی بنیاد پر اس کے مردہ جسم کو ٹکڑے، ٹکڑے کیا گیا، جبکہ یہ الزام اورنگ زیب پر لگایا جاتا ہے کہ اس نے سمبھاجی کو شکست کے بعد اس کی لاش کے ٹکڑے کروائے۔ بعد میں ان ٹکڑوں کو مہاروں نے جمع کیا اور آخری رسومات ادا کی، جبکہ مراٹھے برہمنوں کے خوف سے پیچھے ہی رہے۔ یہی وجہ ہے کہ مہارواڑہ میں سمبھاجی کی سمادھی ہے اور ساتھ ہی جس مہار سماج کے شخص نے ہمت دکھا کر آخری رسومات ادا کی، بغل میں اس کی سمادھی ہے۔ گذشتہ سالوں میں مہار اور مراٹھا سماج میں انتشار کی خاطر ہندوتوادیوں نے تاریخ سے ان واقعات کو حذف کیا۔ جس میں سمبھاجی بھڑے اور ملندا یکبوٹے جیسے کارکنوں کی کوششیں شامل ہیں۔ پھر مارچ ۲۰۱۷ء میں سمبھاجی کے یوم پیدائش کے موقع امیت شاہ کو مدعو کیا گیا تھا، جو شریک تو نہیں ہوا۔ بہر حال تب سے اس علاقے میں مراٹھوں کے درمیان مہار سماج کے خلاف نفرت پھیلانے کا کام جاری، اس بنیاد پر کہ سمبھاجی کی سمادھی ایک مہار کی سمادھی کے ساتھ کیسے ہوسکتی ہے۔ ۲۹ دسمبر ۲۰۱۷ء کو بھڑے اور ملند ایکبوٹے کی قیادت میں شرپسندوں نے گووند مہار کی سمادھی کو نقصان پہونچایا، اور ماحول خراب کرنے کی شروعات کی۔ دوسری طرف ۱ جنوری کو مہار سماج جو دوسو سالہ جشن منانے جا رہے تھے، اس کی اس کی مختصر تاریخ یہ ہے کہ ۱۸۱۸ء میں پیشوا باجی راو دوم کے خلاف، مہاروں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی جنگ میں مدد کی اور فتح حاصل کی۔ جس کی بنیاد یہ تھی کہ مہار سماج کے لوگ باجی راو دوم کے منووادی قوانین کے فروغ دینے کے اقدام سے سخت نالاں تھے۔ ۱۹۲۷ء میں امبیڈکر اس جگہ پر گئے، تو انہوں نے کہا کہ یہ لڑائی دراصل برہمنی ظلم کے خلاف، انصاف کی لڑائی تھی۔ اس تاریخ کو بھی مراٹھا سماج میں، مہاروں کے خلاف زہر گھولنے کے لئے، مہار بمقابلہ مراٹھا کے انداز سے پیش کیا جارہا ہے۔ تبھی ۳۱ دسمبر ۲۰۱۷ء کو سیکولر پارٹیوں کی میٹنگ سے عمر خالد اور جگنیش میوانی نے خطاب کیا، ان

کے خطابات کو مراٹھا عوام میں توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا اور اس بنا پر بھی مراٹھا سماج میں مہاروں کے خلاف نفرت پھیلانے کی کوشش کی گئی۔ مراٹھا سماج کے نوجوانوں کے درمیان نفرت انگیز ویڈیوز موبائل کے ذریعے پھیلائے گئے۔ بالآخر ار جنوری ۲۰۱۸ کو بھیما کورے گاوں کے دوصد سالہ جشن کے موقع پر جب ہزاروں کی تعداد میں مہار جمع ہوئے، تو اس مجمع پر پتھراو کیا گیا اور تشدد بھڑکا یا گیا، جس میں ایک مراٹھا نوجوان کی موت بھی واقع ہوئی۔ بہرحال یہ ہندوتوادیوں کی ایک سازش تھی، جس کے ماسٹر مائنڈ ملند ایکبوٹے اور سمبھاجی بھڈے جیسے کارکنان تھے۔ مگر عوام نے بڑی حد تک صبر و ثبات کا مظاہرہ کیا، جس کے باعث کسی بڑے فساد کا خطرہ ٹل گیا۔

پی بی ساونت: شرپسندوں کی جانب سے کیا گیا پروپیگنڈہ ہی اس تشدد کا اصل سبب ہے۔ مہار آبادی اس جشن کو طبقاتی نظام کے خلاف ایک جدوجہد کی حیثیت سے مناتی ہے۔ لیکن شرپسند ہندوتوادی اور آر ایس ایس کارکنان نے یہ پروپیگنڈہ کیا کہ مراٹھوں کی موت پر جشن منایا جارہا ہے۔ اس بات کے واضح ثبوت بھی سامنے آئے ہیں، لیکن تفتیش میں دانستہ طور پر ان کو نظر انداز بھی کیا جارہا۔

سوال: برسر اقتدار پارٹی بی جے پی، کا نعرہ ''سب کا ساتھ، سب کا وکاس'' کی معنویت ان واقعات کے تناظر میں کیا رہ جاتی ہے، اور اس طرح کے واقعات سے ان کی سیاسی قوت پر کیا اثرات مرتب ہو سکتے ہیں؟

کولسے پاٹل: مودی اور امیت شاہ جیسے لیڈران کی قیادت والی بی جے پی، کے لئے تو وکاس (ترقی) کا مطلب محض امبانی، اڈانی جیسے کارپوریٹس کی ترقی ہے، جنہوں نے الیکشن میں بی جے پی کی مدد کی۔ مذکورہ نعرہ تو سراسر، ایک فریب ہے۔ کسانوں اور دیگر غریب و متوسط طبقات سے جو معاشی بہتری کے وعدے اس حکومت نے کئے، ان کو وفا کرنا تو درکنار، انہیں لو جہاد، مندر۔ مسجد تنازعہ، گئو رکشا جیسے غیر ضروری ایشوز میں الجھا کر رکھا، تا کہ عوام کی توجہ روٹی، کپڑا، مکان، تعلیم اور صحت جیسی بنیادی ضرورتوں پر نہ جائے۔ یہ بھی بی جے پی اور آر ایس ایس کی ایک طویل المعیاد منصوبہ بندی کا حصہ ہے، جسے سمجھنا چاہئے۔ جب نریندر مودی، گجرات کا وزیر اعلیٰ بنا تو جعلی بنیادوں پر، او بی سی کا سرٹیفکٹ حاصل کیا۔ پھر گودھرا سانحہ، گجرات فسادات اور فرضی انکاونٹر جیسی وارادات کی بنیاد پر ہندو مسلم منافرت کی خلیج بڑھاتے گئے۔ ہندو مسلم، پاکستان، کشمیر جیسے ایشوز کو جلا بخشتے رہے، تا کہ نفرت کی سیاست کو غذا ملتی رہے، اور عوامی ترقی کی باتیں کم ہوں۔

جہاں تک سوال بی جے پی کے مفادات پر اثر اندازی کا ہے، اب بی جے پی حکومت خود کو ان واقعات کے اثرات سے پرے سمجھتی ہے اور وہ تو اس ملک کے جمہوری نظام ہی کو ختم کرنے کے درپے ہے۔ میرے اندازے کے مطابق تو اگلے عام انتخابات سے قبل پاکستان یا چین سے جنگ کی بنیاد پر ایمرجنسی لا کر، نریندر مودی اپنی کرسی کو بچانے کا انتظام کرے گا۔ کیونکہ گذشتہ انتخابی نتائج سے ہی واضح ہے کہ محض ۳۰ رفیصد کے قریب عوامی ووٹوں کے حصول کی بنیاد پر ہی بی جے پی نے جیت حاصل کی ہے، جس کا مطلب تقریباً ملک کی ۷۰ رفیصد عوام بی جے پی کا اقتدار نہیں چاہتی، اور اگر یہ ۷۰ رفیصد عوام اب متحد ہورہی ہے تو بی جے پی کے لئے اب اقتدار سے ہاتھ دھونے کا وقت آ گیا ہے۔ گجرات کے انتخابی نتائج میں آپ دیکھئے کہ بی جے پی کے تقریباً ۱۲ رنمائندے ۴۰۰ تا ۱۰۰۰ کے ووٹوں کے فرق سے ہارے ہیں۔ جہاں تک اپوزیشن کے مقام پر رہنے والی کانگریس پارٹی کا سوال ہے، ان کو بھی اس بات کا واضح ادراک ہو گیا ہے کہ وہ تنہا حکومت بنانے کے بجائے، دیگر سیکولر پارٹیوں پر انحصار کرتے ہیں، اور یہ ایک خوش آئند بات ہے۔ بہرحال بی جے پی کی موجودہ پوزیشن دیکھتے ہوئے مجھے اندازہ ہے کہ یہ ای وی ایم مشین میں گڑبڑی یا ایمرجنسی جیسی صورتحال تک جانے سے گریز نہیں کریں گے۔

پی بی ساونت: اگر آپ بی جے پی کی تاریخ کو دیکھیں تو یہ سلسلہ قدیم منووادی نظام کے حاملین سے چلا آرہا ہے۔ صدیوں سے آریہ برہمن جو ہندوستانی سماج کا ۲ تا ۳ فیصد ہیں نے یہاں ''بانٹو اور راج کرو'' کی حکمت عملی کے تحت براہ راست یا بلا راست حکومت کی ہے۔ آریوں کی ہندوستان آمد کے بعد یہاں کی حکومت پر قبضہ کرنے میں ان کا سب سے بڑا ہتھیار ''چتر ورنا'' (سماج کی چومکھی تقسیم) کا نظام تھا، جس میں خود کو انہوں نے سب سے اعلیٰ مقام پر رکھا، اور بقیہ تمام لوگوں کو نہ صرف ادنیٰ گردانا بلکہ ان میں مزید ضمنی تقسیم کی (حتیٰ کہ آج ۶۰۰۰ سے زائد ضمنی ذاتیں موجود ہیں)، مستزاد ان کے درمیان آپسی دشمنی کو فروغ دیا۔ تعلیم تک محض آریہ برہمن کے مردوں کو رسائی کو روا رکھا گیا، اور یہ ان کے ظالمانہ اقتدار کو قائم رکھنے میں انتہائی مددگار اقدام رہا۔ بالآخر انگریزوں کے دور حکومت میں مہاتما پھلے اور دیگر سماجی مصلحین کی کوششوں سے سماج کے ادنیٰ طبقات کی تعلیم تک رسائی کے نتیجہ میں بڑے پیمانے پر سماجی بیداری آئی۔ موجودہ دور میں دائیں اور بائیں اور اس طرح کے دیگر محاذوں کے بیچ شدید اختلافات اسی تعلیمی بیداری کے نتیجے میں مساوی حقوق کی جنگ ہے۔ اس بیداری میں ڈاکٹر امبیڈکر کی شخصیت ایک اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ ماضی سے تا حال ظاہر ہوتا ہے کہ بہرحال بی جے پی کی سیاست ہمیشہ ہی ''سب کا ساتھ'' سے پرے ہی رہی ہے۔

سوال: موجودہ دلت تحریک، مراٹھوں کی تحریک سے کس طرح مختلف ہے؟

کولسے پاٹل: ان تحریکوں کو اختلافی نقطہ نظر کے بجائے، اشتراک کی بنیاد پر دیکھنا چاہئے۔ مراٹھوں میں جو غریب طبقہ ہے، اور دوسری طرف جو دلت ہیں، ان کے مسائل کم و بیش ایک ہی ہیں۔ روٹی، کپڑا، مکان، تعلیم، صحت وغیرہ۔ لہٰذا دونوں تحریکات ایک دوسرے کے قریب آرہی تھیں۔ اس جدوجہد کو متحد ہونے سے روکنے کے لئے موجودہ سازش کی جارہی ہے۔ ہماری کوشش یہی ہے کہ ہندوتوا مخالف تمام جماعتیں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کریں۔ بالخصوص مسلمان اور مسلم جماعتیں بھی سیکولر غیر مسلم حضرات کے ساتھ تعلقات بہتر بنائیں اور ان کے مسائل میں دلچسپی لیں۔ ہم اس طرح کی کوششیں سالوں سے کرتے آرہے ہیں، اور آئندہ بھی اس طرح کی کوششیں کرنے کی ضرورت ہے۔ پاپولر فرنٹ آف انڈیا (PFI) اور سوشل ڈیموکریٹک پارٹی آف انڈیا

(SDPI) جیسی تنظیمیں جو اس طرح کے متحدہ محاذ کا حصہ بنتی ہیں، ان کے خلاف اکثر شدت پسند ہونے کا پروپیگنڈہ بھی کیا جاتا ہے، جس کی تازہ مثال ڈاکٹر ہادیہ کا ایشو ہے۔ ان پروپیگنڈوں سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔

سوال: موجودہ حالات میں سیاسی قوت کی ہیرا پھیری کے بارے میں آپ کا خیال ہے؟

کولسے پاٹل: سماج کے محروم طبقات جیسے مسلم، دلت وغیرہ کو ایک پلیٹ فارم پر آنا بے حد ضروری ہے، تاکہ موجودہ ہندوتوادی طاقتوں کے خلاف ایک محاذ قائم کیا جا سکے۔ بادل ناخواستہ کانگریس کے ساتھ اس جدوجہد کا حصہ بنا جا سکتا ہے۔ اگر بہتر نمائندگی ہو تو کانگریس کے ساتھ اپنی شرطوں پر اتحاد کرتے ہوئے ایک طاقتور سیاسی محاذ بنایا جا سکتا ہے۔

پی بی ساونت: نئی سیاسی مساوات کے تعلق سے حالات کافی سازگار ہیں۔ جس طرح سے گذشتہ پچاس سالوں کے دوران سماجی سطح پر تبدیلی آ رہی ہے اور غیر برہمن طبقات کے آپسی روابط پروان چڑھے ہیں، یہ نئے سیاسی محاذ کی جانب پیش رفت ثابت ہوگا۔ کیونکہ روایتی طور دلتوں کو سماج سے کاٹ کر رکھا جاتا تھا، جب کہ اب یہ علٰحدگی برہمنوں کے حصے میں آ رہی ہے۔

سوال: بی جے پی کی فرقہ وارانہ سیاست کا بنیادی ایجنڈا، بالخصوص مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کو متحد کرنا، کے بارے میں آپ کیا سوچتے ہیں؟

کولسے پاٹل: میرے خیال سے برہمنوں کی مسلمانوں سے کوئی خاص دشمنی نہیں ہے۔ بلکہ وہ محض غیر برہمن ہندوؤں کے سامنے مسلمانوں کا ڈر دکھا کر اپنا الّو سیدھا کرنا چاہتے ہیں، اس لئے وہ مسلمانوں کے غیر ملکی ہونے کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں، اور ملک پر مسلمانوں کے قبضہ کا اندیشہ پیش کرتے رہتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ہندوستان میں مسلمان بکثرت یہاں کے مقامی باشندے ہی ہیں، بلکہ جنوبی ہند کے نمودری برہمنوں نے ہی سب سے پہلے عیسائی اور پھر اسلام مذہب کو اختیار کیا۔ اس کے علاوہ جو پسماندہ طبقات یہاں کے طبقاتی ورن نظام سے پریشان تھے انہوں نے اسلام قبول کیا۔ یہ مسلمانوں کا ڈر پیدا کرنے کی چال دراصل آر یہ برہمن اور سرمایہ دار طبقہ کی سانٹھ گانٹھ کا نتیجہ ہے۔ مستزاد یہ لوگ ہندو طبقات کے بیچ بھی تفریق ڈالنے کا کام برابر کرتے رہتے ہیں، بلکہ یہ کہنا غلط نہیں کہ ''بانٹو اور راج کرو'' کی پالیسی انگریزوں نے انہی لوگوں سے سیکھی۔

پی بی ساونت: سماج میں طبقاتی نظام (ہندوں کے درمیان) کو برقرار رکھنا ہمیشہ ہی بی جے پی کا بنیادی ایجنڈا رہا ہے۔ جہاں تک مسلمانوں کا سوال ہے، وہ غلط تاریخی حوالوں سے ہندوں میں مسلمانوں کا خوف بھی پیدا کرتے ہیں، اور اپنے مفاد حاصل کرتے ہیں۔ اس بات کو سمجھنے کی ضرورت ہے کہ ہندوتوا فکر کے حامل بھارت میں ۴ تا ۵ فیصد سے زیادہ نہیں ہیں، لہٰذا اپنے کے مفاد کے لئے مسلم دشمنی کا شور بھی بی جے پی کے وجود کے لئے ضروری ہے۔

سوال: مسلم اور دلت، اس ملک کے محروم طبقات میں سے ہیں، کیا وجہ ہے کہ اپنے حقوق کی جدوجہد میں دونوں ہی طبقات اب بھی متحد نظر نہیں آتے؟

کولسے پاٹل: ملک کو بچانے کی ذمہ داری دراصل مسلمانوں کو اٹھانی ہوگی۔ اس ملک کی سب سے بڑی اقلیت ہونے کے ناطے، مسلمانوں کو غیر مسلموں سے بڑے پیمانے پر تعلقات استوار کرنے کی ضرورت ہے۔ اس ضمن میں اب تک جو کوششیں مسلمانوں کی جانب سے ہوئی ہیں، وہ مسلمانوں کی آپسی تفریق کی وجہ سے کچھ خاص نتائج نہیں پیدا کر سکیں۔ اس تفریق کی سب سے بڑی مثال جمیعۃ علما کے دو دھڑوں کی شکل میں سامنے ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کو آپسی اتحاد اور دیگر غیر مسلموں سے اتحاد کی جانب بڑے پیمانے پر پیش رفت کرنی ہوگی۔ بالخصوص مسلم مذہبی جماعتوں کے لیڈران کو شدید زمینی کام کرنے کی ضرورت ہے۔ دلتوں کے ساتھ اصل مسئلہ ان کی غیر ذمہ دار اور بے ایمان قیادت ہے، جس میں رام داس آٹھولے اور پاسوان جیسے نام سرفہرست ہیں۔ لہٰذا دلتوں کی جانب سے اصل کوشش ان کی ایماندارانہ قیادت بنانے کی ہونی چاہیئے۔

پی بی ساونت: دلت اور مسلمانوں کی دوری کی وجوہات عمومی ہندو۔ مسلم منافرت کی توجیہات سے مختلف نہیں ہیں۔ ہندوتوا طاقتوں کا ہندو مسلم بنیاد پر تقسیم کا ایجنڈا ہمیشہ سے کارگر رہا ہے۔ دو قومی نظریہ دراصل ساورکر نے ہی پیش کیا تھا، جسے اب تک استعمال کی جا رہا ہے۔ محروم طبقات ہونے کے حوالے سے مسلمانوں اور دلتوں کو کے اتحاد کے بجائے ہمیں تمام ہی سماجی طبقات کے اتحاد کی بات کرنی چاہیے، اور یہ اتحاد اصلاً مفاد پرستوں کے خلاف ہونا چاہیے، کیونکہ مفاد پرستی ہی اصل خطرہ ہے۔ خود ساورکر جو ہندوتوا تحریک کا تاسیسی کارکن ہے، وہ انڈمان میں قید سے قبل ایک سیکولر شبیہ کا مالک تھا، یہاں تک کہا جاتا ہے کہ ہندو مسلم اتحاد کے حامی بادشاہ اکبر کا یوم پیدائش منایا کرتا تھا۔ پھر اس نے برطانیہ کے ایما پر ہندو مسلم منافرت کو فروغ دیا، تاکہ اپنے مفادات حاصل کر سکے۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ سب سے پہلے دوسرے درجہ کا شہری ہونے کی جو مغلوبیت ہمارے اذہان میں ہے، اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔

سوال: برہمنوں کے تعلق سے آپ کے جو خیالات ہیں، اس کے مطابق کیا تمام برہمن انہی سازشوں میں ملوث ہیں؟

کولسے پاٹل: ممکن ہے کہ اچھے برہمن بھی ہوں۔ لیکن برہمن طبقہ سے ایسا کوئی بھی نمایاں نام تلاش کر پانا ممکن نہیں، جس نے عمومی لحاظ سے پورے سماج کی ترقی کے لئے کام کیا ہو۔ کیونکہ برسر اقتدار برہمن طبقہ کے علاوہ جو دیگر عام برہمن ہیں، وہ بھی محض مفاد پرستی کی خاطر ایسا کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہتے اور یہ ان کی تنگ دلی کا واضح ثبوت ہے۔ سماج کے جن پسماندہ طبقات کو ان کے حقوق دلانے کی جدوجہد میں ہم ایک پلیٹ فارم پر انہیں لانا چاہتے ہیں، اس میں اگر کوئی برہمن بھی شامل ہونا چاہے تو ہم اس کا استقبال کریں گے، مگر بالیقین ایسا کوئی برہمن ہوگا نہیں۔

القدس معاملے پر کیا اسلامی ممالک متحدہ طور پر امریکہ کو سبق سکھائیں گے؟

سید شعیب ہاشمی، او دیگر

۶/دسمبر کو امریکہ کے صدر ڈونالڈ ٹرمپ نے مقبوضہ بیت المقدس کو اسرائیل کا دارالحکومت قرار دے کے دنیا بھر کے مسلمانوں کے جذبات کو زبردست ٹھیس پہنچائی ہے۔ اس فیصلہ کے فوری بعد ایک طرف جہاں فلسطین میدان جنگ میں تبدیل ہو گیا ہے وہیں دوسری جانب پوری دنیا میں پر تشدد احتجاج اور مظاہروں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ عالمی سطح پر مختلف تنظیموں اور اداروں کی جانب سے امریکہ پر اپنا فیصلہ واپس لینے کیلئے دباؤ بنانے کیلئے اجلاس طلب کئے جا رہے ہیں۔ ڈونالڈ ٹرمپ کی جانب سے متنازع فیصلہ کا اعلان ہوتے ہی تمام مسلم ممالک کے علاوہ عرب لیگ، او آئی سی، اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل، جامعہ ازہر اور دیگر تنظیموں کی جانب سے ہنگامی جلسوں کا انعقاد عمل میں آیا جس میں اس بات پر سب نے اتفاق کیا کہ امریکہ کو اپنا فیصلہ واپس لینے پر مجبور کیا جائے اور مشرقی یروشلم کو فلسطین کا دارالحکومت تسلیم کیا جائے۔

امریکی فیصلہ کے خلاف یوں تو تمام مسلم ممالک اپنی آوازیں بلند کرتے ہوئے نظر آ رہے ہیں لیکن اس معاملہ میں فلسطین، ترکی، اردن، ایران، لبنان، انڈونیشیا، ملائشیا، تیونیشیا اور پاکستان ہی بہت زیادہ پیش پیش نظر آ رہے ہیں۔ جبکہ عرب ممالک جن میں خاص طور سے سعودی عرب، مصر، بحرین اور متحدہ عرب امارات جن پر تمام دنیا کے مسلمان امید لگائے بیٹھے ہیں وہ اس معاملہ میں کھل کر کسی بھی اقدام کا اشارہ نہیں دے رہے ہیں جس کی وجہ سے مسلمانوں میں ناراضگی بھی ہے اور تشویش بھی۔

اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ۱۳/دسمبر کو استنبول میں ہونے والے او آئی سی (آرگنائزیشن آف اسلامک کوآپریشن) کے ہنگامی سربراہی اجلاس میں شرکت کیلئے ان ممالک نے اپنے وزیر خارجہ، صدر یا وزیر اعظم کو بھیجنے کے بجائے مذہبی امور کے وزراء جو بھیجا۔ او آئی سی اجلاس میں ۵۷ ممالک کے رہنماؤں نے شرکت کی تھی جن کی تصویر کو دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا کہ دنیا بھر کے مسلم رہنماؤں کی اتنی زبردست جمعیت اور طاقت کے باوجود آخر ٹرمپ نے کس طرح القدس کو صہیونی ریاست تسلیم کرنے کا یکطرفہ فیصلہ کرنے کی ہمت کی۔

سعودی عرب، بحرین، مصر اور متحدہ عرب امارات کے سربراہوں یا کسی بھی قابل ذکر سیاسی شخصیت کی او آئی سی کے اجلاس میں عدم شرکت کی وجہ سے دنیا بھر میں ان ممالک پر تنقیدیں کی جا رہی ہیں۔ اس کے برعکس لاطینی امریکہ کے ملک وینزویلا کے صدر نکولس ادورو نے غیر متوقع طور پر شرکت کر کے سب کو حیران کر دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ امریکی فیصلہ کے خلاف فلسطینی عوام کے ساتھ کھڑے ہیں۔

او آئی سی کی اس میٹنگ میں سعودی عرب کے سربراہ کی عدم شرکت موضوع بحث بن گئی ہے اور کہا جا رہا ہے کہ ایک طرف تو سعودی عرب فلسطینی کاز کی مکمل حمایت اور مظلوم فلسطینیوں کے ساتھ شانہ بشانہ کھڑا ہونے کا دعویٰ کرتا ہے، مگر جب کسی بڑے پلیٹ فارم پر جمع ہو کر کھل کر اس کی حمایت میں آواز بلند کرنے کا وقت آتا ہے تو وہ پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ سعودی عرب کے سربراہ کی عدم شرکت کے سبب اب او آئی سی میں شامل ممالک کے آپسی تعلقات پر بھی سوالات اٹھ رہے ہیں اور کہا جا رہا ہے کہ یہ ممالک تو خود ہی متحد نہیں ہیں، پھر وہ القدس کی حفاظت کیا کریں گے اور امریکی فیصلہ کا منہ توڑ جواب کیسے دیں گے۔

امریکی اعلان کے دوسرے ہی دن سے دنیا بھر میں احتجاج اور مظاہرے ہوئے اور جمعہ کو ہندوستان اور بیرون ممالک کی مساجد میں مسجد اقصیٰ کے موضوع پر خطبہ جمعہ دیا گیا اور نماز کے بعد احتجاج بھی کیا گیا۔ لیکن مسجد حرم اور مسجد نبویؐ میں پہلی جمعہ کو اس موضوع پر کوئی بیان نہیں ہوا جس کی وجہ سے بھی مسلمانوں میں ناراضگی نظر آئی۔ اس کے بعد والی جمعہ کو امام حرم نے خطبہ میں امریکی فیصلہ کی سخت مذمت کی اور کہا کہ ہم ہمیشہ ہی القدس کے ساتھ رہے ہیں۔ جبکہ مسجد نبویؐ کے امام نے کہا کہ دین پر مکمل آوری کی جائے تو القدس پر فتح حاصل ہوگی۔

اس کے علاوہ سعودی عرب کی شوریٰ کونسل کی جانب سے منعقدہ جلاس میں بھی سرسری طور پر فلسطین کی حمایت کی گئی اور صرف مطالبے ہی کئے گئے کوئی ٹھوس لائحہ عمل تیار نہیں کیا گیا۔ اس اجلاس میں اصل توجہ مشن ۲۰۳۰ء پر دی گئی۔ فلسطین کے تعلق سے عرب ممالک کے اجلاس اور میٹنگیں نشستن گفتن برخاستن کے مصداق رہیں۔ مزید ستم یہ کہ اسرائیل کے وزیر برائے انٹیلی جنس نے سعودی عرب کی غیرت کو للکارتے ہوئے اسرائیل۔ فلسطین تنازع کو حل کرنے کیلئے سعودی عرب کو کلیدی رول ادا کرنے کی اپیل کی۔ اس نے یہ مطالبہ کیا کہ محمد بن سلمان اسرائیل کا دورہ کریں اور نیتن یاہو کو عرب دورے پر مدعو کریں حالاں کہ دونوں ممالک میں سفارتی تعلقات نہیں ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ ساری دنیا کے مسلمان سعودی عرب کو انتہائی احترام اور عقیدت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور سعودی عرب کے پوری دنیا پر بڑھتے اثر ورسوخ کو دیکھ کر یہ امید لگائے بیٹھے ہیں کہ تمام عرب اور اسلامی ممالک ایک ساتھ مل کر صہیونی منصوبوں کا قلع قمع کر دیں۔ لیکن سعودی عرب خواتین کو بااختیار بنانے، ان کو ڈرائیونگ لائسنس جاری کرنے، غیر ملکی ملازمین پر ٹیکس عائد کرنے، فلموں کی نمائش کیلئے تھیٹر کی شروعات کرنے اور اپنی معیشیت کو مضبوط کرنے میں مصروف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قبلہ اول کے امام نے خطبہ جمعہ میں اس دکھ کا اظہار کیا کہ اگر مسلم اور عرب ممالک دلیری اور یکجہتی کا مظاہرہ کرتے تو آج یہ دن نہیں دیکھنا پڑتا تھا۔

بہرحال ترکی، اردن، ملائشیا، انڈونیشیا، ایران، پاکستان، تیونیشیا اور دیگر کچھ ممالک امریکہ کو آنکھ میں آنکھ ڈال کر بات کر رہے ہیں۔ رجب طیب اردگان اور انڈونیشیا کے صدر نجیب رزاق نے بیت المقدس میں اپنا سفارت خانہ کھولنے کا اعلان کیا ہے۔ سوشل میڈیا پر رجب طیب اردگان اور اردن کے فرمانرا شاہ عبداللہ دوم کی تقریروں اور ان کی جانب سے ہونے والے اقدامات کی دھوم ہے۔ یہی چند مسلم لیڈر ہیں جو صرف تقریروں، اعلانات اور مطالبوں کے بجائے عملی طور پر امریکی فیصلہ کی سختی سے مذمت کر رہے ہیں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ بیت المقدس میں کون کون سے مسلم اور عرب ممالک اپنا سفارتخانہ کھول کر امریکہ کی دھمکیوں کو بے اثر ثابت کرتے ہیں۔

اسلام کا تصورِ تعلیم

نوید السحر صدیقی

تاریخ کی بصارت نے دیکھا ہے کہ ترقی، عزت، تکریم وشہرت اس قوم کا مقدر بنی جس نے علم کو سرمایہ حیات بنالیا ہو۔ دنیا کی ہر قوم کو اس قوم کے آگے اپنا سرخم کرنا پڑا جس غور وفکر، تحقیق اور علم کی دنیا میں عرق ریزی کی، باوجود اس کے ترقی یافتہ اور علم کی علمبردار قومیں بھی انسانی زندگی کے خلاء کو آج تک نہیں پاٹ سکیں جو خود اسی نے مذہب اور علم کے درمیان پیدا کیا تھا۔ انسانی نفسیات یہ کہتی ہے کہ مذہب اور علم انسانی زندگی کے دو اہم پہلو ہیں جن میں سے ایک کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ایک پہلو انسان کی روحانی تسکین وتکمیل کا باعث ہے اور ایک پہلو اس کی ذہنی وعقلی تسکین وتکمیل کا۔ لیکن اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے بجائے مذہب اور علم کو ہر دفعہ دو انتہائی مختلف تصورات کے طور پر پیش کیا گیا۔ جو شخص علم اور غور وفکر کے میدان میں اترا، اسے مذہب سے دور کیا گیا اور جس نے مذہب کی راہ چُنی وہ علم کی تجلی سے محروم رہا۔ گویا علم اور مذہب وہ دو علیحدہ علیحدہ، مختلف مدار ٹھہرے جو چاہے اس پر محورِ گردش ہوجائے، جو چاہے اس پر محو گردش ہوجائے جب کہ دونوں ہی مدار اسے اپنی اپنی جانب کھینچ رہے ہوں بھلا یہ کیوں کر ممکن ہو کہ ایک ہی انسان بیک وقت دو مختلف مداروں پر گردش کرسکے؟ اس طرح تو نظامِ زندگی درہم برہم ہوجائے اور ہوتی رہی ہے۔

انسانی زندگی کی اس پیچیدہ گتھی کو اسلام سلجھاتا ہے۔ یہ علم کا ایک ایسا وسیع تصور دیتا ہے جو انسان کے ذہن ودل کو مطمئن کرتا ہے Appeal کرتا ہے۔

۱۔ **مقصدِ علم:** نفس انسانی کے لئے کسی بھی کام کا مقصد ناگزیر ہے، بے مقصد زندگی انسان کو کاہل، خود غرض، عیش پسند بنا دیتی ہے نیز جو مقصد جتنا بلند ہوگا وہ اتنا ہی شخصیت کو سنوارے گا۔ دنیا کی کوتاہ نظری ہے کہ اس کے نزدیک علم جیسی عظیم نعمت کے حصول کے مقاصد انتہائی قلیل مدتی اور ادنیٰ ہوتے ہیں۔ ایک عام انسان کے علم حاصل کرنے کا مقصد روزگار کا حصول، عزت کا حصول یا اپنے شوق / خواہش کی تکمیل ہوتا ہے اس کے برعکس اسلام اسے ایک بہت ہی عظیم مقصد عطا کرتا ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے انسان کو اپنا نائب بنا کر اس جہاں میں بھیجا ہے، یعنی اس کی زندگی کا مقصد اللہ کے نظام کو زمین پر نافذ کرنا ہے۔ جب اللہ نے آدمؑ کی تخلیق کی اور فرشتوں سے عرض کیا کہ زمین پر میرا نائب ہوگا تب فرشتوں نے عرض کیا: ''انھوں نے عرض کیا'' کیا آپ زمین میں کسی ایسے کو مقرر کرنے والے ہیں جو اس کے انتظام کو بگاڑ دیگا اور خونریزیاں کرے گا؟ آپ کی حمد وثنا کے ساتھ تسبیح اور آپ کے لئے تقدیس تو ہم کر ہی رہے ہیں'' (البقرۃ:۲۹)۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''میں جانتا ہوں، جو کچھ تم نہیں جانتے'' ۔۔۔۔ ''اس کے بعد اللہ نے آدم کو ساری چیزوں کے نام سکھائے (علم دیا)۔ گویا خلافت کے میدان میں اترنے کا ہتھیار یعنی تسبیحات وعبادات نہیں تھے بلکہ علم تھا۔ گویا علم ہی وہ وجہ امتیاز تھا جس کی بناء پر انسان کو فرشتوں سے افضل قرار دیا گیا تھا، علم ہی وہ چیز تھی جو انسان کو درجہ کمال پر پہنچایا تھا۔ چنانچہ علم کے حصول کا یہ وہ عظیم مقصد ہے جو انسان کی ہمہ وقت یکسوئی وتوجہ چاہتا ہے۔

۲۔ **علم، ایمان وعقیدے کی بنیاد:** اسلام، مذہب وعلم کو ایک سکے کے دو پہلوؤں کی طرح پیش کرتا ہے یہ ایک دوسرے سے اس طرح جڑے ہیں کہ ایک، دوسرے کو محور عطا کرتا ہے تو دوسرا پہلے کو۔ علم، ایمان، یقین وعقیدے کی بنیاد ہے اور ایما علم کی بنیاد ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ''پڑھو! (اے نبیؐ) اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا'' ۔ (العلق۔۱)

گویا کہا جارہا ہے کہ علم حاصل کرو لیکن اس طرح کہ وہ تمہیں اللہ سے قریب کردے، علم حاصل کرو اور اس حقیقت کو قبول کرو کہ بے شک یہ علم اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے عطا کیا ہے۔ اسی طرح اگر اس کو اُلٹا کہا جائے تو اسلام ایمان کی بنیاد وعلم پر رکھتا ہے کہ غور وفکر کرو اور اللہ پر ایمان لاؤ۔ اندھا دھند ہر کسی کی پیروی نہ کرو اور اپنی عقل لڑاؤ۔ پڑھو، غور وفکر کرو تو ایمان لاؤ، اللہ کی قدرت سے آنکھیں نہ میچو۔ تمہارا علم حاصل کرنا اللہ کی معرفت کے لئے ہو اور ایمان لاؤ تو غور وفکر کے بعد لاؤ، تمہارے عقیدے اور یقین کی بنیاد علم وغور وفکر پر ہو۔

۳۔ **علم کے ساتھ تربیت کا تصور:** انسان کی شخصیت کے مختلف پہلو ہیں، یہ اپنے آپ میں ایک مکمل کائنات ہے۔ اس کی شخصیت کے یہ تمام پہلو صرف علم ہی کے محتاج نہیں بلکہ انھیں ایک خاص تربیت کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ دنیاوی نظریہ علم میں علم کے ساتھ تربیت کا کوئی تصور نہیں ملتا جب کہ اسلام میں تعلیم وتربیت لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔

انسانی زندگی کا بلند وبالا مقصد اگر صرف علم سے مکمل ہوتا تو اللہ سبحان وتعالیٰ کا کتاب کا نازل کردینا ہی کافی تھا اس کے ساتھ ایک مربی کو انسانوں کی تربیت پر معمور کرنا دراصل اسی 'تربیت' کے تصور کو واضح کرتا ہے۔ قرآن میں ہے کہ ''جس طرح میں نے تمہارے درمیان خود تم میں سے ایک رسول بھیجا جو تمہیں میری آیات سناتا ہے، تمہاری زندگیوں کو سنوارتا ہے، تمہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور تمہیں وہ باتیں سکھاتا ہے جو تم نہ جانتے تھے'' ۔ (البقرۃ۔۱۰۱)

غرض یہ کہ علم کا اسلامی تصور اتنا وسیع ومکمل ہے کہ یہ کسی پہلو کو تشنہ نہیں رکھتا باوجود اس کے ہم ہی وہ قوم ہیں جس کی علم سے غفلت حد سے بڑھی ہوئی ہے۔ ہم خود علم کو اس لئے حاصل کرتے ہیں کہ کوئی روزگار حاصل کرلیں کجا کہ ہم لوگوں کو اس عظیم تصور سے روشناس کروائیں۔

اولڈ ایج ہوم

جدید مغربی تہذیب کا غریب حصہ ہے!

عرفان شاہد

اولڈ ایج ہوم کی شروعات کیسے ہوئی اور کب ہوئی اور اس کا موجد کون ہے ایک مختلف فیہ مسئلہ ہے لیکن قرائین سے پتہ چلتا ہے کہ اولڈ ایج ہوم کی ابتداء یورپ سے ہوئی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ نیوکلیر فیملی سسٹم ہے اور دوسری وجہ مادی دنیا میں غرق ہوجانا ہے۔

درج ذیل اشعار یورپ کے تہذیب کی عکاسی کرتی ہیں۔

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا
آج تک فیصلہ نفع و ضرر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا

یورپ کی ترقی سے کسی کو انکار نہی ہے لیکن علامہ اقبال کا یہ شعر یورپ کی اس سائنسی ترقی کو سمجھنے میں ہماری کافی حد تک مدد کرسکتی ہے۔ یورپ میں جو سائنسی ترقی ہوئی اسکا دارومدار ظنی علوم (Experimental Knowledge) پر ہے۔ قران کریم بھی انسان کو ظنی علوم کے حصول پر ابھارتا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ قطعی علم (Revealed Knowledge) سے چمٹے رہنے کی ہدایت دیتا ہے۔ والدین کی خدمت کیوں کرنی چاہیے؟ اسکا جواب صرف قطعی علم میں موجود ہے جو قران میں مضمر ہے۔ سائنس نے انسان کو خلاء میں چلنے کا ہنر سکھا دیا، لیکن بازار میں کیسے چلنا چاہیے، والدین کے ساتھ کیسا برتاو کرنا چاہیے؟ انسان اس ہنر اور سلیقے سے عاری رہ گیا۔ اخلاقیات کا علم صرف اللہ کی کتاب اور پیغمبر کی سنت میں مضمر ہے۔ یورپ نے ظنی علوم کو سیکھنے اور سکھانے کے لیے بے دریغ پیسہ خرچ کیا لیکن شہوانی خواہشات کی تسکین، والدین کے ساتھ حسن و سلوک کا سلیقہ سکھانے سے قاصر رہا۔ اس کی کئی وجوہات ہوسکتی ہیں، لیکن بنیادی وجہ یہ ہے کہ یورپ نے اپنی نسل کو دینی علوم سے بہت دور رکھا۔ عیسائی مذہب کو یورپ میں مرکزی حیثیت حاصل ہے لیکن اسکا عمل دخل صرف کچھ تیوہار وغیرہ منا لینے تک ہی محدود ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ عیسایت میں اس قدر تدلیس ہے کہ وہ اپنی نسل کو دین پر گامزن کرنے سے قاصر ہے۔ موجودہ نسل دین اور خدا کے تصور کو بہت حقیر سمجھتی ہے۔ چنانچہ موجودہ نسل کچھ معاملات میں اخلاقیات سے عاری ہیں جن کا تعلق دین سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ والدین کو اولڈ ایج ہوم میں ڈال دیتے ہیں۔ یورپ میں جو کتابیں اخلاقیات کے نام پر اسکولوں میں پڑھائی جاتی ہیں اس میں والدین کے حقوق کے تعلق سے کوئی باب نہیں۔ یورپ بالخصوص برطانیہ میں بچے والدین کی ملکیت نہیں ہوتے، عموما وہاں بچوں کی رائے والدین کے متعلق ایک نرس جیسی ہوتی ہے، جسکی ذمہ داری بچوں کی تیمارداری کرنا ہوتا ہے۔ نیز والدین کو بھی بچے پیدا کرنے اور انکی پرورش کرنے کی کوئی خواہش نہی ہوتی ہے لیکن بسا اوقات وہ قدرت کے نظام کے سامنے بے بس ہوجاتے اور اسطرح سے کچھ بچے پیدا ہوجاتے اور جن کے کھانے پینے، رہنے سہنے اور تعلیم و تربیت کی ذمہ داری حکومت پر ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بچے نہ ہی والدین کی بات مانتے اور نہ ہی انکی عزت کرتے ہیں۔ والدین بچوں کو غلط کام پر ڈانٹنے سے بھی ڈرتے ہیں۔ اور بچوں کو بھی زمانے کا رنگ دیکھ کر یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ ان کی پیدا ایس ایک اتفاقیہ عمل ہے اس میں ان کے والدین کا کوئی اہم رول نہیں ہے۔ عموما والدین بھی دو سے زائد بچوں کی پرورش کرنے سے کتراتے ہیں۔ والدین کے اس عمل سے بچوں کو بھی یقین ہوجاتا ہے کہ ان کے والدین ان کے متعلق کچھ مثبت سوچ نہیں رکھتے۔ چنانچہ جب یہ والدین ضعیف ہوجاتے ہیں اور بچے والدین کو بوجھ سمجھنے لگتے ہیں اور بچے اس بوجھ سے چھٹکارہ پانے کے لئے اپنے والدین کو اولڈ ایج ہوم میں چھوڑ آتے ہیں۔ کبھی کبھار سال میں ایک مرتبہ تیوہار کے موقع پر رسماً ملاقات کر لیتے ہیں۔ یہ والدین بلک بلک کر اولڈ ایز ہوم میں انتقال کرجاتے ہیں۔

یورپ میں بسنے والے ایشیائی اور افریقی نژاد لوگ اس تہذیب سے دور تھے لیکن رفتہ رفتہ وہ بھی اس تہذیب کا حصہ ہوتے جارہے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ اسلام سے دوری ہے۔ اس میں مساجد کا بھی کچھ رول ہے۔ آپ کو راقم الحروف کے اس جملے سے اختلاف ہوسکتا ہے لیکن راقم الحروف کی یہ رائے اس کے ذاتی تجربہ پر منحصر ہے۔ یہ کسی کتاب اور مضمون کا چربہ نہیں ہے۔ یہ ایک تاریخ ہے کہ انیسویں صدی میں بے شمار گرجا گھروں کو مسجدوں میں تبدیل کیا گیا۔ چرچ کا مسجدوں میں تبدیل ہونا بڑی خوشی کی بات ہے لیکن ساتھ میں تاسف کا بھی مقام ہے۔ ہمیں اس سے سبق لینا چاہیے۔ قران مجید بار بار اسکی تلقین کرتا ہے۔ عیسائی مذہب کے جدید عقیدے کے مطابق چرچ کو بیچا جا سکتا ہے۔ یورپ میں جب رفتہ رفتہ مذہب بیزاری کا رجحان شروع ہوتو نوجوانوں نے چرچ جانا بند کردیا۔ چرچ کافی عرصے سے بند تھے۔ چنانچہ چرچ کے ذمہ داران نے چرچوں کو بیچنا شروع کیا۔ مسلمانوں نے اس موقع کو کافی سنہرا تصور کیا اور بند چرچوں کو خرید کر مسجدوں میں تبدیل کرنا شروع کردیا۔ اسطرح سے یہ سلسلہ ایک عرصے تک جاری رہا۔ مسلمانوں نے یورپ میں بے شمار مسجدیں تعمیر کرلیں۔ یہ سلسلہ جب نیا تھا لوگ مسجدوں میں خوب جایا کرتے تھے لیکن اب یہ سلسلہ رفتہ رفتہ کمزور پڑتا چلا جارہا ہے۔ مسجدیں خالی رہنے لگی ہیں۔ تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ مسجدیں عبادت گاہ کے ساتھ تربیت گاہ بھی ہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ مسجد نبوی میں عبادت کے ساتھ لوگوں کی تربیت بھی کرتے تھے لیکن نیم خواندہ حضرات جو کسی طریقے سے مسجدوں کے ٹرسٹی بن گئے ہیں انہیں کچھ معلوم نہیں کہ بچوں کی تربیت کیسے کی جائے اور کہاں کی جائے۔ ایسے لوگ یورپ کی بے شمار مسجدوں میں کم عمر کے بچوں کو آنے سے منع کرتے تھے۔ نتیجتاً ان بچوں کی دلچسپیاں بدلتی گئیں، اور ایسے ہی بچے بڑے ہوکر مسجدوں سے بدظن ہوتے جارہے ہیں۔ بچے بڑے ہونے کے بعد اپنے والدین کو بھی اولڈ ایج ہوم کے سپرد کررہے ہیں۔ میں نے بہت سارے ایسے والدین کو روتے ہوئے دیکھا ہے۔ درمیان تعلیم راقم الحروف خود اولڈ ایج ہوم میں کام کرچکا ہے اور یورپ کی بے شمار ایسی مسجدوں میں نماز پڑھ چکا ہے جہاں جلی حرفوں میں بچوں کو مسجد میں لانے پر پابندی کا پیغام لکھا ہے۔ ایسی مسجدوں میں لوگ اس شخص کو گھور کر دیکھتے ہیں جو سہواً چھوٹے بچے کو مسجد میں لے آئے۔

یہ سلسلہ اب ہندوستان بھی میں شروع ہوگیا ہے۔ شہروں میں بسنے والے لوگ اپنے بوڑھے والدین کو اپنے ساتھ نہیں رکھنا چاہتے ہیں۔ بعض پڑھی لکھی عورتیں بھی شوہر کے والدین کو ساتھ میں نہیں رکھنا چاہتی ہیں۔ طرح طرح کے بہانے تلاش کرتی رہتی ہیں۔ میرے پاس دعوت تبلیغ سے وابستہ عورتوں کے کئی مسائل آئے، جو اپنے بوڑھے ساس اور سسر کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی تھیں۔ وجہ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ بوڑھے ساس سسر کی خدمت کو اپنا بنیادی فریضہ تصور نہیں کرتیں۔ چنانچہ وہ شوہر کے بوڑھے والدین کو اپنے ساتھ نہیں رکھنا چاہتی ہیں۔ دوسری اہم وجہ ہے کہ میاں بیوی دونوں نوکری پیشہ ہوتے ہیں، لہذا والدین کی خدمت کرنے کا موقع نہیں مل پاتا ہے۔ تیسری وجہ یہ ہوتی ہے کہ شہروں میں لوگوں کے پاس کشادہ مکان نہیں ہوتے۔ شہروں میں مکان مہنگے بھی ہوتے ہیں۔ ہر آدمی خریدنے کا متحمل نہی ہوسکتا ہے۔ لہذا بوڑھے والدین کو علیحدہ رکھتے ہیں۔ یہی ساری وجوہات ہیں جس کی وجہ سے لوگ اپنے بوڑھے والدین کو اولڈ ایج ہوم میں رکھنا چاہتے ہیں۔

کچھ لوگ اسے ترقی کی علامت سمجھتے ہیں لیکن حقیقت میں یہ تنزلی ہے۔ ہمیں اپنی آنے والی نسل کو اس سے بچانا ہوگا۔

خود شناسی اور جنوں کی داستانِ "حرفِ شوق"

عالم نقوی

کسبِ کمال کن کہ عزیزِ جہاں شوی!

اور مختار مسعود بھی خود شناسی اور جنوں کی یہ داستان مکمل کرنے کے بعد آج سے قریب نو ماہ قبل ۱۵ ؍اپریل ۲۰۱۷ کو اپنے اُنہی احباب کی طرح ''حرفِ شوق'' بن گئے جن کی فرمائش پر اُنہوں نے علی گڑھ اور سرسید کی یہ تاریخ اپنے خزینہ ذہن سے صفحہ قرطاس پر منتقل کی تھی۔ پانچ سو ترسٹھ صفحات کی اپنی چوتھی اور گزشتہ تینوں کتابوں 'آواز دوست'، 'سفر نصیب' اور 'لوحِ ایّام' کی طرح حسبِ عادت ایک اور لازوال کتاب لکھ کر اُس کے شایع ہونے سے پہلے ہی، ۹۱ سال کی بھر پور، بامعنی اور نہایت کار آمد زندگی گزار کر اپنے رَب کی رِضا کا حصہ بن گئے۔

علی گڑھ، سرسید اور 'اسٹریچی ہال' کے طویل اور خصوصی پس منظر میں مسلم یونیورسٹی کی یہ کہانی انہوں نے قرآن کریم کی اس مختصر سورۃ سے شروع کی ہے کہ ''زمانے کی قسم ! انسان گھاٹے میں ہے۔ سِوَائے اُن کے جو ایمان لائے اور عملِ صالح کرنے کے ساتھ دوسروں کو بھی حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرتے رہے''۔

وہ لکھتے ہیں کہ ''ہمارا بچپن کساد بازاری کی نذر ہو گیا۔ لڑکپن سایہ تیغ میں گزرا۔ دوسری جنگ عظیم کے ختم ہونے تک ہم نوجوانی کی سرحد پار کر چکے تھے (اس) سرحد کے دوسری طرف خانہ جنگی نے ہمارا استقبال کیا۔ مسلمانوں نے بڑی قربانی دی۔ کچھ خوشی سے، کچھ لاچاری کے سبب۔ بین الاقوامی سیاست میں کمزور کو انصاف کب ملا ہے جو ہمیں ملتا!'' (حرف شوق ص ۱۴)

مختار مسعود میں بہت کچھ ایسا ہے جو اُنہیں اپنے جیسے دوسرے بڑوں سے الگ کر دیتا ہے۔ مثلاً یہی کہ نہ اُنہوں نے کسی اور کی کتاب کا پیش لفظ لکھا نہ کبھی کسی کو انٹرویو دیا۔ اِلّا اپنی زندگی کے اس پہلے اور آخری انٹرویو کے جو انہوں نے اپنے انتقال سے دو سال قبل ۲۲ مارچ 2015 کو نوائے وقت کو دیا تھا جسے اپریل ۲۰۱۷ میں ان کے انتقال کے بعد اخبار نے دوبارہ شایع کیا جس میں انہوں نے اعتراف کیا تھا کہ انہوں نے : ''۔۔کسی بھی صحافی کو پچھلے بیس برس میں انٹرویو نہیں دیا۔ پچیس تیس سال ہو گئے (نہ انہوں نے کبھی کوئی) پیش لفظ لکھا نہ (خود) اپنے اوپر کوئی رائے لکھی (البتہ) اس دوران (یہ ضرور ہوا کہ) ایک موصوف نے اپنے آپ ہی انٹرویو بنایا اور چھاپ دیا۔۔'' (امر شاہد کی کتاب 'صاحب آواز دوست مختار مسعود۔ ۲۰۱۷۔ ص ۴۲۱)

نام کتاب	حرف شوق
مصنف	مختار مسعود
ناشر	مکتبہ تعمیر انسانیت
صفحات	561
زبان	اردو

اُن کے بچپن میں ایک بار علی گڑھ میں اُن کے والد کی فرمائش پر، جو مسلم یونیورسٹی کے شعبہ معاشیات میں پروفیسر تھے، مولانا غلام رسول مہر نے مختار مسعود کے لیے یہ دعا کی تھی کہ اے اللہ! اس بچے کو بھی تصنیف و تحقیق کا شوق اور ہنر عطا کر دے'! (دیباچہ۔ حرف شوق) بارگاہ ایزدی سے یہ دعا اس درجہ مستجاب ہوئی کہ اگر انہوں نے اپنی ساری زندگی ''آواز دوست'' کے سوا اور کچھ نہ لکھا ہوتا تو بھی تصنیف و تحقیق، تخلیق و تنقید اور ادب و دانشوری کے میدان میں وہ اسی طرح اپنا جواب آپ ہوتے جیسے آج ہیں۔

''حرف شوق'' کے اختتامیہ میں وہ لکھتے ہیں کہ ''میری زندگی ایک ایسے انقلاب سے عبارت ہے جس میں میرے بچپن نے آنکھ کھولی اور میری جوانی نے ہوش سنبھالا۔ اس صبح انقلاب کو دیکھنے کے لیے زندہ ہونا ایک سعادت تھی۔ دراصل یہ 'خود شناسی اور جنوں کی داستان' تھی جو کبھی پرانی نہیں ہو سکتی بلکہ زمانہ اُسے بار بار دہراتا ہے، فرق صرف نام، مقام اور وقت کا ہوتا ہے۔ نام جو بدل سکتا ہے، مقام جو پیچھے رہ جاتا ہے، اور وقت جو کبھی تیزی اور کبھی آہستگی سے ریت کی مانند ہاتھوں سے پھسل جاتا ہے۔ اسی لیے میری یہ داستان ایسے موڑ پر پہنچ کر ختم ہوتی ہے جب میرے وہ ساتھی اپنا راستہ بدل چکے تھے جن کے ساتھ میں نے زندگی شروع کی تھی۔ ایک دن کم از کم دو نسلوں کے حائل ہو جانے کے بعد میں نے بچپن کے ایک ساتھی سے اپنے عہد (۱۹۴۷ سے قبل کی ربع صدی) کے علی گڑھ (مسلم یونیورسٹی) کی سب سے اہم اور منفرد عمارت (اسٹریچی ہال) کا قصہ سنانے کا وعدہ کیا تھا۔ یہ کتاب اسی وعدے کی تکمیل ہے۔ (لیکن) وہ دوست۔ کہیں نظر نہیں آ رہا۔ غالباً میں نے لکھنے میں دیر کر دی یا اُسے جانے کی جلدی تھی۔! چند احباب جو یاد آ رہے ہیں وہ سب اس جہان سے کوچ کر چکے ہیں لیکن ایک مصنف کی حیثیت سے میرے لیے وہ اَب بھی زندہ ہیں۔ مگر یہ کسے معلوم تھا کہ آج جب کہانی اپنی تکمیل کو چھو چکی ہے تو وہ جو اس کے مرکزی کردار تھے، یوں سب کے لیے 'حرفِ شوق' بن کے رہ جائیں گے۔ اُنہیں جانے کی جلدی تھی یا میرے رَب کی رِضا اسی میں تھی کہ اس کہانی کے منظر عام

پر آنے سے پہلے وہ دنیا سے گزر جائیں۔۔۔‘‘ (حرفِ شوق ص ۵۶۳۔۵۶۴)

کتاب کی آخری چند سطریں ان کی ساٹھ برسوں کی رفیقۂ حیات عذرا مسعود کی ہیں۔ وہ لکھتی ہیں کہ ’’اس کتاب پر وہ ایک طویل عرصے سے کام کر رہے تھے۔ مختلف اَوقات میں اِس۔۔۔ کے مندرجات کے بارے میں اُن کے خیالات بدلتے رہے۔ کبھی وہ اسے محض پہلے دو مضامین تک محدود رکھنا چاہتے تھے اور کبھی بعد کے دو مضامین کا اضافہ بھی گوارا کر لیتے۔ اب کہ حتمی رائے کے لیے وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ ہم نے یہ چاروں مضامین شاملِ کتاب کر لیے ہیں کہ اُن کی شخصیت اور فن کی تفہیم کے لیے یہ مضامین بہت اہم ہیں۔ اگر انہیں مسعود کی (اس) آخری کتاب میں شامل نہ کیا (جاتا) تو قارئین اُن کی شخصیت کے اُن گوشوں سے (کبھی) آگاہ نہ ہو سکتے جن پر یہ مضامین روشنی بکھیر رہے ہیں۔

حرفِ شوق آموختم، واسوختم۔۔۔ آتش اَفسردہ۔ باز اَفروختم‘‘ (حرفِ شوق ص ۵۶۴)

اللہ کا صد ہزار شکر کہ عذرا مسعود نے کتاب کے دونوں اولین اَبواب ’’ماضی کے ساتھ ایک نشست‘‘ جو بیشتر اسٹریچی ہال کے حوالے سے مسلم یونیورسٹی کے قیام کی تاریخ اور سرسید کے عزائم سے عبارت ہے، اور ’’سرسید احمد خان کون تھے‘‘ کے ساتھ آخری دونوں ابواب ’’باعثِ تحریر‘‘ اور ’’مرحوم کے نام ایک خط‘‘ بھی شاملِ کتاب کر لیے اور اِس طرح ’حرفِ شوق‘ کو ’دو آتشہ‘ ہی نہیں ’چہار آتشہ‘ بنا دیا!

تیسرے باب کا باعثِ تحریر اُن کے صدیقِ مکرّم اور ہمارے بانوے سالہ جوان بزرگ محترم ریاض الرحمن خاں شروانی (مدیر ماہنامہ ’فکرِ نو‘ حبیب منزل، میرس روڈ، علی گڑھ) کا ایک خط بنا جو انہوں نے عرصہ پہلے لاہور کے کسی رسالے کے مدیر کو لکھا تھا جس میں اِس حیرت کا اظہار تھا کہ ’’زمانہ طالب علمی میں اُن کے دوست مختار مسعود کی کوئی سرگرمی اس کی گواہی دیتی ہوئی نظر نہیں آتی کہ آگے چل کر وہ ’اپنی توجہ اور توانائی کا وافر حصہ اردو نثر (کو جدید اور جاوداں ادبی شہپاروں‘ کی فراہمی) کی نذر کرنے والا ہے! اُس زمانے میں (بھول کے بھی) اُس نے اردو ادب میں (اپنی) عملی اور گہری دلچسپی کا کوئی ایسا تائیدی ثبوت بہم نہیں پہنچایا جو دوستوں کو یہ سوچنے پر مجبور کرتا کہ یہ ساتھی کبھی اس پالے میں بھی زور آزمائی کے لیے اتر سکتا ہے‘‘۔ (حرفِ شوق ص ۳۸۰)

مختار مسعود لکھتے ہیں کہ ’’یہ بات غلط اندازے کی نہیں بلکہ عدم شہادت کی ہے۔ واقعات کی فہرست بنانا سوانح نگار اور مؤرخ کے لیے بہت آسان ہوتا ہے مگر توقعات و امکانات کی مکمل فہرست کاتبِ تقدیر کے سوا اور کون بنا سکتا ہے۔ ریاض الرحمٰن کی رائے پڑھ کر میں نے شکر ادا کیا کہ وہ ارادہ جسے میں صیغۂ راز میں رکھنا چاہتا تھا، قریبی دوستوں پر بھی نہ کھلا۔ سچ یہ ہے کہ میں ’حجابی فرقے‘ سے تعلق رکھتا ہوں جو اپنے خیالات۔۔۔ ترجیحات اور خواہشات کو سات پردوں میں چھپا کر رکھتے ہیں موقع بہ موقع ایک سے لے کر چھے تک پردے اُٹھتے اور گرتے رہتے ہیں (لیکن) ساتواں پردہ کبھی نہیں اُٹھتا۔ جس منظر کی تاب آدمی خود نہ لا سکتا ہو وہ دوسروں کو کیونکر دکھائے؟۔۔۔ ریاض الرحمٰن کا خط پڑھنے کے بعد میں اُن اسباب کی کھوج میں نکلا۔۔۔ فہرست طویل تھی۔ مختصر کرتے کرتے تین نکات پر آ کر رک گیا۔ ایک نصیحت۔ ایک کتاب، (اور) ایک کنواں!‘‘

’’نصیحت والدِ محترم کی تھی۔ یک مشت نہیں بلکہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں۔ یکدم نہیں بلکہ ایک طویل عرصے کے دوران۔ یہی کوئی آٹھویں جماعت سے لے کر ایم اے تک۔‘‘ (حرفِ شوق ص ۳۸۱۔۳۸۲)

نصیحت یہ تھی کہ صرف فکر و اسلوب کی وسعت، ندرت اور گیرائی کی حامل کتابوں کا مطالعہ کیا جائے اور خود بھی صاحبِ طرز و صاحبِ اُسلوب بننے کی اَنتھک کوشش اور پیہم مشق کی جائے البتہ مقبولیت کسی لکھنے والے کے بس میں نہیں کہ بقول حافظ: قبولِ خاطر و لطفِ سخن خداداد است۔۔۔ اور یہ کہ۔۔۔ این سعادت بزورِ بازو نیست۔ تا نہ بخشد خدائے بخشندہ! اپنے وقت کے دونوں ’آزادوں‘ محمد حسین اور ابوالکلام کو پڑھنے کی نصیحت بطورِ خاص تھی جس پر مختار مسعود نے حرفاً حرفاً، لفظاً اور معناً ہر طرح عمل کیا یہاں تک کہ بی اے کا امتحان شروع ہونے سے پانچ دن قبل مولانا آزاد کی ’غبارِ خاطر‘ ہاتھ آ گئی جسے پڑھنا شروع کیا تو یہ بھی یاد نہ رہا کہ پانچ روز بعد بی اے کا امتحان شروع ہونے والا ہے۔ چوبیس گھنٹے بعد جب یہ کتاب پڑھ کے رکھی تو اس کا جادو پوری طرح چڑھ چکا تھا۔

مختار مسعود لکھتے ہیں: ’’غبارِ خاطر ختم ہوئی میں نے اسے جہاں سے اٹھایا تھا وہاں واپس رکھنا چاہا (تو) کتاب نے کہا (کہ اب) باقی باتیں امتحان کے بعد ہوں گی اس وقت تو (مجھے) تم سے ایک عہد لینا ہے کہ ’’میں مسمی مختار مسعود متعلم بی اے (سالِ آخر) بقائمی ہوش و حواس اور برضا و رغبت یہ عہد کرتا ہوں کہ اگر حالات سازگار ہوئے اور زندگی نے موقع دیا تو میں بالیدگی، شائستگی اور حکمت کے اِس سبق کو جو مجھے اردو اور فارسی کی اس نثر نے دیا ہے قرضِ حسنہ سمجھتے ہوئے بقلم خود قسط وار اتارنے کی پوری پوری کوشش کروں گا۔ اللہ میرا حامی ناصر ہو۔‘‘ اس عہد کا اپنوں کو پتہ چلا نہ غیروں کو۔ میں نے اس کو چھے پردوں کے پیچھے چھپا دیا تھا۔ پردے گرانے کے لیے ایک لمحہ بہت تھا۔ اُنہیں اُٹھانے کے لیے ایک عمر درکار تھی۔۔۔ تو برادرم ریاض الرحمٰن خاں شروانی! اگر تم مجھ سے اس ترغیبی تحریر کی نشاندہی کے لیے کہو جس کی مثال، کشش، انگیخت اور فیضان نے مجھے سنجیدگی سے اردو نثر لکھنے پر آمادہ کیا تو میں بلاتکلف غبارِ خاطر کا نام لوں گا۔‘‘ (حرفِ شوق ص ۳۷۹۔۴۰۶)

اب جہاں تک کنویں کا معاملہ ہے تو ایک حقیقی ہے جس کی منڈیر پر بیٹھ کر وہ مستقبل کے سپنے سجاتے تھے اور معنوی تو بے شمار ہیں۔ بقول مختار مسعود ’’مسلم یونیورسٹی کے نامور اساتذہ سب بڑے گہرے اور پُرآب کنوئیں تھے۔ کسی کنویں پر میں اوک لگا کر پیاس بجھائی۔ کسی سے دو چار ڈول ڈول پانی لیا کسی سے دس بیس۔ چند کنویں ایسے بھی تھے جن سے میں نے ڈول کے بجائے چرس (رہَٹ سے بیلوں کے ذریعے کھینچ کر پانی نکالنے والا چمڑے کا بڑا ڈول) بھر کر پانی لیا اور کشتِ آرزو (تمناؤں کی کھیتی) کو خوب خوب سیراب کیا۔ ایک چرس پانی میں اس کنویں سے بھی لیا جس کی منڈیر پر بیٹھ کر ایک بار میں نے اردو نثر کی خدمت کا خواب، سرِشام دیکھا تھا۔ وہ کنواں رشید احمد صدیقی کے گھر کی زمین میں واقع تھا اُنہوں نے گھر کی دیوار کو خم دے کر اُس کنویں کو گھر کے باہر ہی رکھا تا کہ ہر کوئی بے روک ٹوک اپنی پیاسی آرزوؤں کو سیراب کر سکے۔‘‘ (ص ۴۱۷) اور لاہور بھی ان کے نزدیک ایک کنویں ہی کے نمانند تھا جہاں سول سروس سے سبکدوشی و

وظیفہ یابی کے بعد انہوں نے مستقل سکونت اختیار کی تھی۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''لاہور (بھی تو) ایک کنویں (ہی) کی مانند ہے، اس کی تہ سے ٹھنڈے، میٹھے اور صاف پانی کے سوتے (گزشتہ) ایک ہزار برس سے پھوٹ رہے ہیں۔ میں (ٹھہرا) دزتِ آرزو کا ایک بے قرار مسافر۔۔ جہاں کہیں کنواں نظر آتا ہے اس کی منڈیر پر بیٹھ جاتا ہوں۔ دل کو قرار آجاتا ہے۔ علی گڑھ کے کنویں کی منڈیر سے میں خود اُٹھ کر نہیں آیا تھا۔ حالات نے اُٹھا دیا۔ اب لاہور کے کنویں کی منڈیر سے اُٹھ کر کہیں اور جانے کو جی نہیں چاہتا۔ سنت ہے کہ ہجرت زندگی میں صرف ایک بار کی جاتی ہے'' (حرفِ شوق ص ۴۲۳)

انھوں نے لکھا ہے کہ غبار خاطر کے مطالعے سے جو سب سے بڑا فائدہ انہیں ہوا وہ یہ کہ: ''امتحان کا خوف دل سے جاتا رہا۔۔ جامعاتی اور رسمی تعلیم کا حکمت اور دانش سے ہرگز کوئی تعلق نہیں۔ (اسی طرح) فکر و نظر کا بھی تعلیمی اسناد (ڈگریوں) سے کوئی علاقہ نہیں۔ (اس) زور پر نہ کوئی اچھا شعر کہہ سکتا ہے نہ اچھی نثر لکھ سکتا ہے۔ نہ اچھی کہانی کہہ سکتا ہے اور نہ اچھی تصویر بنا سکتا ہے۔ اِن منزلوں کے راستے اور (ہی) ہیں۔ سنگلاخ اور دشوار گزار۔ تلوے چھلنی ہو جاتے ہیں۔ جسم پسینے پسینے اور چور چور ہو جاتا ہے (کیونکہ) جسم ایک آرام طلب ذات ہے۔ 'کسبِ کمال' کے لیے اُسے بہت بے آرام ہونا پڑتا ہے۔ تب جا کر 'عزیز جہاں شوی' کی منزل آتی ہے۔ اور آدمی مُڑ کر دیکھتا ہے تو حیران ہو جاتا ہے کہ ذرا سی بے آرامی اور اس کا اتنا بڑا صلہ! قدرت کتنی فیاض ہے۔ اور انسان کتنا نا سمجھ۔'' (حرف شوق ص ۴۰۳)

وہ علی گڑھ کی مٹی سے جنمے اور پوری دنیا کی خاک چھان کر اس طرح 'کسبِ کمال کیا کہ 'عزیز جہاں' ہو گئے۔ آج وہ لاہور کی مٹی میں آسودہ اور 'قدرت کی فیاضی سے ہمیشہ کے لیے 'زندہ' ہیں!

قارئین اپنے سوالات بذریعہ ای میل یا وہاٹس ایپ (اس نمبر پر 9673022736) بھیج سکتے ہیں۔

سوال: کہا جاتا ہے کہ اللہ نے انسان کو امتحان کے لئے پیدا کیا ہے۔ مگر اس امتحان کی مدت ہر انسان کے لئے ایک جیسی کیوں نہیں ہے؟ کسی کی ۷۰ یا ۶۰ سال اور کوئی تو ۳۰ یا ۲۰ سال ہی میں مرجاتا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ایک انسان ۲۰ یا ۲۵ سال میں ہی اس دنیا سے رخصت ہوجائے تو وہ جنت میں جائے گا یا جہنم میں؟ اگر جنت میں جائے تو بہت خوش نصیب ہے اور جہنم میں جائے گا تو کیا اس کے ساتھ ناانصافی نہیں ہے؟ (محمد محی الدین اسامہ، حیدرآباد)

جواب: اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ امتحان کی نوعیت میں اور ہمارے بورڈ اور یونیورسٹی کے امتحان میں فرق ہے۔ ہمارے امتحانات انسان کی داخلی کمزوریوں، معاشی اور خاندانی حالات، ذہانت وفطرت کے اعتبار سے امتحان کے سوالات اور چیلنجس میں فرق نہیں کرتے۔ مثلاً دو مختلف طلبہ سے جن کی صورتحال متعدد معیارات کے تحت ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہے، (اچھے اسکول اور اساتذہ کی فراہمی، مالی فراغت، والدین کی دلچسپی، ذہانت کا معیار وغیرہ) لیکن اس کے باوجود دونوں سے یکساں سوالات پوچھے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے جس طالب علم کے لئے ماحول سزاوار رہا ہو، اس کے نشانات دوسرے سے بہتر ہونے کے زیادہ امکانات ہیں۔ جبکہ وہ طالب علم جس نے بڑی مشکلوں سے تعلیم حاصل کی اس کے کم تر نشانات حاصل کرنے کے امکانات زیادہ ہیں۔ دراصل ہمارے ادراک میں جس امتحان کا تصور ہے وہ انسان کی محنت اور صلاحیت، کوشش وعزم کا درست احاطہ نہیں کرپاتا۔ لیکن اللہ رب العزت کے یہاں امتحان کے معیارات بالکل انصاف پر مبنی ہیں۔ وہ اس طرح کہ اللہ ہر شخص سے اس کی مقدرت کے اعتبار ہی سے امتحان کی کیفیت اور اس کا مشکل ہونا طئے کرتا ہے۔ اسے قرآن نے کہا، لایکلف اللہ نفساً الا وسعہا۔ یعنی اگر کسی شخص کو اللہ نے زیادہ صلاحیتوں، علم، دولت، رتبہ، خاندان اور دیگر وسائل سے نوازا تو اس کا امتحان مشکل تر ہوگا۔ لیکن اگر اللہ نے کسی کو اپنی مشیت کے تحت ایسے وسائل سے محروم رکھا تو اس کا امتحان بھی آسان معیارات پر ہی ہوگا۔ مثال کے طور پر ایک دفعہ ایک لونڈی سے اللہ کے رسولؐ نے دریافت کیا کہ اللہ کہاں ہے؟ تو اس نے زبان ہلائے بغیر آسمان کی طرف اشارہ کردیا۔ اللہ کے رسولؐ نے فرمایا کہ وہ جنتی ہے۔

اللہ انسانوں کے درمیان وسائل کی فراہمی میں تفریق کیوں کرتا ہے؟ کیا یہ انصاف کی بات ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ کی امتحان کی اسکیم کی یہی خاص بات ہے کہ وہ مختلف لوگوں کو مختلف طریقوں سے آزماتا ہے۔ وہ کسی کو دولت سے تو کسی کو ناداری سے، کسی کو اولاد سے تو کسی کو تعلیم سے، کسی کو رتبہ سے اور کسی کو گم نامی سے آزماتا ہے۔ اسی طرح وہ لوگوں کو طویل مہلت عمل اور قلیل مہلت عمل کے ذریعے بھی آزماتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ لمبی عمر کے لوگوں کے نامۂ اعمال میں کم عمر پانے والے لوگوں کے نامۂ اعمال کے مقابلے میں زیادہ اچھے اعمال ہوں گے۔ اور اسی بنیاد پر وہ جنت کے زیادہ مستحق قرار دئے جائیں گے۔ بلکہ حقیقت حال کے اعتبار سے یہ دیکھا جائے گا کہ تناسب کے اعتبار سے کس نے اپنی مہلت عمل میں کس حد تک بہتر کام انجام دئے۔ اگر بہت چھوٹی مہلت عمل میں کسی نے زیادہ اچھے کام انجام دئے تو اس کا درجہ لمبی عمر پانے والے سے بڑھ کر ہوگا۔ کئی احادیث میں، جوانی کی عبادت کو بڑھاپے کی عبادت سے افضل قرار دیا گیا ہے۔ اسی طرح قبر میں پوچھے جانے والے سوالات میں جوانی کے کاموں کا خصوصی تذکرہ ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اللہ کی امتحان کی اسکیم میں جوانی کو زیادہ وقعت اور وزن دیا گیا ہے۔

یہاں یہ تذکرہ بے جا نہ ہوگا کہ کم عمری میں ہر لمحہ خدا کی راہ میں صرف کرنا سب سے آسان طریقہ ہے جس کے ذریعہ ہم بڑے بزرگوں کے مقابلے میں جنت کے اعلیٰ ترین مقامات کے مستحق بن سکتے ہیں۔

سوال: اخلاقیات کی تعریف کیا ہے؟ اگر اچھائی اور برائی کا شعور انسان کی فطرت کے اندر ودیعت کردیا گیا ہے تو پھر مذہب کی ضرورت کیا ہے؟ اسی طریقے سے کیا انسان کی فطرت موقع ومحل کے اعتبار سے تبدیل ہوتی ہے؟ مثلاً جسم ڈھانپنا انسان کی فطرت میں ہے۔ لیکن ہندوستان کے شمالی علاقوں میں کچھ ایسے قبائل ہیں جہاں مرد وعورت ننگے رہتے ہیں۔ اور کچھ قبائل میں سگے بھائی بہن کے درمیان شادی کوئی عیب نہیں۔ کیا ان کا عمل فطرت کے عین مطابق ہے یا خلاف فطرت؟ (عدیل احمد، حیدرآباد)

جواب: آپ نے تصور اخلاق، تصور مذہب اور فطرت کے بارے میں ایک بڑا طویل بحث کا متقاضی سوال پوچھا ہے۔ اس سوال کے جواب میں سب سے پہلے میں یہ کہوں گا کہ آپ کو اسلام کے تصور اخلاق پر اور انسانی فطرت سے متعلق کتابوں سے استفادہ کرنا چاہئے۔ البتہ رفیق منزل کے ذریعے اس کا مختصر جواب اس طرح پیش خدمت ہے۔

اللہ رب العزت نے انسانوں میں ایک نفس ناطقہ کا وجود رکھا ہے۔ اس کا کام یہ ہے کہ انسانوں کو تمیز کرنا سکھائے۔ بہتر و کہتر، اچھا اور برا، صحیح وغلط وغیرہ۔ یہ نفس ناطقہ ہی ہے جو تمام انسانوں کو ایک جیسا بناتی ہے۔ عدل، امانت داری، محبت وغیرہ کو پسند کرنا اور ظلم، فساد، نفرت وغیرہ سے ابا کرنا یہ اس نفس کے عمومی پہلو ہیں۔ لیکن انسان کے نفس کی تربیت بھی کی جاسکتی ہے۔ یعنی گو عدل پسندیدہ ہے، لیکن ظلم کا عادی بننا بھی انسانوں کے لئے ممکن ہے۔ نفس میں فرشتوں سی بھی صفات پیدا کی جاسکتی ہیں اور اس میں جانوروں کی بھی صفات در آسکتی ہیں۔ انسانوں سے مطلوب یہ ہے کہ وہ بہیمیت (جانوروں کی صفات) سے اوپر اٹھنے کی کوشش کرے۔ جو اس کوشش میں جتنا کامیاب ہوگا، اتنا ہی انسانیت کی معراج پر پہنچے گا۔

جب انسان کا نفس بہیمیت کی طرف آمادہ ہو تو بہت سارے غیر معقول اور فساد پر مبنی امور درست اور فطری معلوم ہونے لگتے ہیں۔ اس لئے کسی معیار کا ہونا ضروری ہے، جو کہ انسان کی فطرت کا دقیق اور معروضی مطالعہ کرنے کے بعد ترتیب دیا جاسکے۔ اس معیار کے ذریعے انسانوں کے لئے ممکن ہوسکے کہ وہ اپنی فطرت کو سمجھ سکیں۔ اگر اس معیار یا پیمانے میں وہ یہ پائیں کہ ان کا نفس بدی اور فساد کی طرف مائل ہے تو ان کو اپنے نفس کی تربیت کرنے کا موقع مل سکے۔ 'مذہب' یا شریعت یا خدائی ضابطۂ حیات انسان کی اس ضرورت کو پورا کرتے ہیں۔ وہ انسان کو ایسا ہی ایک معیار فراہم کرتے ہیں جیسے انسانوں کی فطرت، انسانوں کے جسم اور انسانوں کے نفس کے خالق نے ترتیب دیا ہے۔ کیونکہ سوائے خالق انسان کے علاوہ کوئی ہستی نہیں جو انسان کی مطلوب کیفیت کا درست اندازہ کرسکے۔ اس لئے اللہ رب العزت کا بنایا ہوا وہ معیار اور ضابطۂ حیات مذہب کی شکل میں سامنے آتا ہے۔

رہی بات مسخ شدہ فطرتوں کے لوگوں کی بات، جن کی حرکتوں کی مثال آپ نے دی ہے، تو انسان چاہے کیسی ہی تاویلات کرلے لیکن ان کا یہ رویہ فطرت انسانی، معقولیت اور خدائی معیارات کے جملہ تصورات کی نفی کرتا ہے۔

گدھوں کے دام بڑھ گئے ۔۔۔

شیخ احمد ضیاء، تلنگانہ

صبح صبح مرزا کی آمد ہمارے لئے کسی سوغات سے کم نہیں ہوتی۔ مرزا کی آمد کے ساتھ ہی ہماری نصف بہتر کے احکامات کی اجرائی پر بریک لگ جاتا ہے، اس لئے ہم مرزا کی آمد کو اپنے لئے فال نیک سمجھتے ہیں۔ مرزا نے گفتگو کا سلسلہ شروع کرتے ہوئے کہا کہ میاں ایک خوش خبری سنو۔ کل اخبار میں ایک خبر چھپی تھی جس میں کہا گیا کہ ہندوستان میں گدھوں کی قیمت میں دن بہ دن اضافہ ہوتا جارہا ہے اور ساتھ ہی ساتھ گدھی کا دودھ جو کئی ادویات میں استعمال ہوتا ہے کافی مہنگا ہوگیا ہے۔ ہم نے کہا مرزا ہمارا ملک اور مہنگائی ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم ہوچکے ہیں۔ اگر اتفاقاً گدھوں کی قیمت اور گدھی کے دودھ کی قیمت میں اضافہ ہو تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ مرزا نے کہا میاں ہم عام مہنگائی کی بات نہیں کررہے ہیں اور نہ ہی ان دنوں یہ موضوع قابل بحث ہے، ہمیں حیرت اس بات کی ہے کہ جس گدھے کو کل تک گدھا ہے کہہ کر نظرانداز کردیا جاتا تھا اس کی بھی اب چاندی ہورہی ہے، ہم نے سنا اس کی قیمت اب لاکھوں میں ہوگئی ہے۔ گدھی کا دودھ بھی فی ملی گرام ہزاروں روپیوں میں بک رہا ہے۔ ایسا لگ رہا ہے کہ جیسے اب کوئی بھی چیز ناکارہ نہیں رہے گی۔ ہم نے کہا مرزا سوائے انسان کے آج کے دور میں ہر چیز مہنگی ہوگئی ہے۔ اگر کسی چیز کی ارزانی ہے تو وہ ہے زندہ انسانوں کی۔ یہی انسان جب مرجاتا ہے تب خودبخود اس کی قیمت بڑھ جاتی ہے کیوں کہ آج کل مُردوں کی تجارت ہورہی ہے اور مردہ انسانوں کو ہاتھوں ہاتھ خریدا جارہا ہے اور اس کی منہ بولی قیمت بھی لگائی جارہی ہے۔ مرزا نے کہا میاں تمہاری اس تلخ حقیقت کو سن کر ہمیں مشہور افسانہ نویس جوگیندر پال کے ایک افسانہ کا مرکزی خیال ذہن میں آرہا ہے۔ اس افسانہ میں یوں ہوتا ہے کہ ایک امریکی، ہندوستان میں مردہ انسانوں کو خریدنے کیلئے آتا ہے اور ایک ہندوستانی کے توسط سے یہ کام کرنا چاہتا ہے۔ یہ ہندوستانی شخص اسے اس بات کا یقین دلاتا ہے کہ وہ اپنے ملک میں جتنے چاہے مردے اسے فراہم کرے گا۔ وہ اس تیقن کے ساتھ امریکن کو غریبوں کی ایک بستی میں لے جاتا ہے جہاں پر کئی بھوکے ننگے بھکمری کا شکار انسانی ڈھانچے جو صرف سانس لیے کیلئے زندہ رہ گئے، موجود رہتے ہیں۔ وہ ان مظلوم ومجبور زندہ انسانوں کو بتا کر امریکی سے کہتا ہے کہ تمہیں جتنے چاہے اتنے ان میں سے خریدلو۔ امریکن کہتا ہے کہ ارے یہ تو زندہ انسان ہیں مجھے انہیں لے کر کیا کرنا ہے۔ ہندوستانی جواب دیتا ہے کہ یہ لوگ برائے نام زندہ ہیں۔ انہیں تم امریکہ لے جانے کی کوشش کرو، ان میں سے آدھے سے زیادہ راستے میں دم توڑدیں گے اور بقیہ امریکہ پہنچ کر۔ امریکن، ہندوستانی کی بات سے ناراض ہوکر وہاں سے خالی ہاتھ لوٹ جاتا ہے، تب ہندوستانی شخص نے ان غریبوں کی جانب دیکھتے ہوئے کہا کاش! تم لوگ مرجاتے۔ اس بہانے تم امریکہ جاتے اور تمہاری بھی معقول قیمت لگتی۔ جوگیندر پال نے اس افسانے میں غریب انسانوں کی زندگیوں کی کافی اچھی تصویر کھینچی تھی اور دنیا کو یہ بتانے کی کوشش کی تھی کہ زندہ انسان اگر مفلسی کا شکار ہو تب وہ کوڑی کے مول کا بھی نہیں۔ ہم نے مرزا سے کہا کہ اس تناظر میں تم نے جو خوش خبری سنائی واقعی وہ ایک سنسنی خیز خبر ہی ہے، کیوں کہ جس معاشرہ میں انسانوں کی قیمت گھٹ چکی ہے، وہاں گدھوں کی قیمت میں دن بہ دن اضافہ ایک اہم خبر ہی ہے۔ چلو چلتے ہیں کسی گدھے سے اس بارے میں گفتگو کریں۔ جیسے ہی ہم مرزا کو لے کر گھر سے نکلے دور سڑک پر ہمیں ایک گدھا نظر آیا۔ ہم نے اسے آواز دی، لیکن ایسا لگا کہ اس نے ہماری آواز سنی ہی نہیں۔ ہم نے مرزا سے کہا شاید یہ گدھا بہرہ ہوگا۔ مرزا نے کہا میاں ایسی کوئی بات نہیں۔ بقول شاعر:

ہے یقین مجھ کو نہ اندھا نہ وہ بہرا ہوگا   وہ گدھا روڈ پہ کچھ سوچتا ٹھہرا ہوگا

ہم نے کہا مرزا تمہیں ہر بات پر شاعروں کی یاد آجاتی ہے۔ خیر ہم دونوں خود ہی اس گدھے کے قریب پہنچے اور اس کی خیریت دریافت کی۔ گدھے نے مسکرا کر ہمیں دیکھا اور ہماری خیریت بھی اپنے پچھلے دو پیروں کو اچھال کر دریافت کی۔ ہم نے اصل موضوع پر آتے ہوئے گدھے سے پوچھا کہ آج کل اخبارات میں آپ لوگوں کی قیمت کے بارے میں کافی چرچے ہیں، اس بارے میں آپ کا اپنا کیا خیال ہے۔ گدھے نے جواب دیا اجی جناب صدیوں سے ہماری کافی ناقدری ہوئی ہے۔ ہم نے ہر دور میں اس پر احتجاج کیا، لیکن ہماری آواز سنی ہی نہیں گئی۔ اگر سنی بھی گئی تب سمجھی نہیں گئی۔ بھلا ہو ان سائنسدانوں کا جنہوں نے ہماری افادیت کو دنیا کے سامنے پیش کیا اور ہمیں بھی قیمتی جانوروں کی فہرست میں شامل کروادیا۔ ہم نے پوچھا، اب آپ کیسا محسوس کررہے ہیں۔؟ گدھے نے کہا ہم آج کل کافی خوش ہیں۔ اس بات پر کہ اب زمانہ ہماری قدر کرے گا۔ ہمیں گھر کا نہ گھاٹ کا کے دائرہ سے باہر نکالا جائے گا۔ ہماری بات سنی جائے گی، سمجھی جائے گی ہمارے مطالبات قبول کئے جائیں گے۔ ہم نے کہا کیا آپ سیاست کے میدان میں آنا پسند کریں گے؟ گدھے نے یہ سن کر دولتی جھاڑ دی اور غصہ سے ہماری جانب دیکھ کر کہا کہ میاں یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہماری قدر و قیمت میں اضافہ ہوچکا ہے ہم سے یہ سوال کررہے ہو؟ میاں اب ہم اس سطح سے کافی اونچے اٹھ گئے ہیں۔ یہ کام ہمارے لائق نہیں رہا۔ ہم نے گدھے کو مزید کریدتے ہوئے کہا کہ آیا وہ اپنی اس قدر و قیمت میں اضافہ کی خوشی میں تہنیتی تقریب منعقد کرنے کا خواہش مند ہے؟ گدھے نے کہا میاں جو اعزاز ہم سے صدیوں سے چھین لیا گیا تھا اس کی بازیابی پر یقیناً ہم سب خوش ہیں لیکن ہمیں یہ چونچلے پسند نہیں۔ یہ تہنیتی تقریب وغیرہ تم انسانوں کو ہی مبارک کیوں کہ تم لوگ آج کل خوشیوں کو ترس رہے ہو اور جب بھی کوئی چھوٹی موٹی خوشی تمہیں مل رہی ہے وہ تمہیں برداشت نہیں ہورہی ہے اور تم لوگ تہنیتی تقریب منعقد کررہے ہو۔ ہم اب پہلے جیسے گدھے نہیں رہے جو انسانوں جیسی حرکتیں کریں۔ ہم نے گدھے کا موڈ بگڑتا دیکھ کر مرزا کو چلنے کا اشارہ کیا اور خدا حافظ کہہ کر وہاں سے چلتے بنے۔

خاص شخصیت

محمد مہدی عاکف

اخوان المسلمون کے ساتویں مرشد عام اور عالم اسلام کے مشہور مفکر اور داعیٔ حق محمد مہدی عاکف مصر میں 12 جولائی 1928ء کو پیدا ہوئے۔ قاہرہ کے شمال میں معروف شہر المنصورہ میں آپ کا بچپن گزرا۔ محمد علی پرائمری اسکول منصورہ میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ قاہرہ میں منتقل ہوگئے۔ یہاں قاہرہ کے علاقے السکاکینی میں انہوں نے سیکنڈری اسکول تک تعلیم حاصل کی۔ آپ 1940 میں 12 سال کی عمر میں اخوان المسلمون سے متعارف ہوئے اور اس چھوٹی عمر میں ہی امام حسن البناء کی خدمت میں حاضری دی۔ امام ان کی ذہانت بھری گفتگو سے بہت متاثر ہوئے اور آپ نے اخوان کے بانی ارکان میں سے ایک شیخ محب الدین الخطیب کو یہ ذمہ داری دی کہ وہ اس ننھے داعیٔ حق پر خصوصی توجہ دیں کیونکہ مرشد عام نے اپنی بے مثال ذہانت سے سمجھ لیا تھا کہ نوخیز مجاہد عظیم انسان بنے گا۔ یوں تعلیم کے ساتھ ساتھ مہدی عاکف اخوان کی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگے۔ خاص طور پر شباب کے شعبہ میں بہت فعال کردار ادا کیا۔ 1951ء میں کلیۃ الحقوق سے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ 1954ء میں جب اخوان پر پابندی لگی تو اس وقت آپ اخوان کی طلبہ ونگ کے صدر تھے۔

مہدی عاکف کو جوانی سے بڑھاپے تک زندگی میں بارہا جیل کے مصائب و مشقتوں سے گزرنا پڑا، مگر وہ ہمیشہ ثابت قدم رہے۔ اگست 1954ء میں ایک جھوٹے الزام کے تحت انہیں پہلی مرتبہ جیل میں ڈالا گیا۔ ان پر حکومت کے خلاف بغاوت کی سازش کرنے کا الزام تھا۔ انہیں سزائے موت سنائی گئی جو بعد میں عمر قید میں تبدیل ہوگئی۔ 20 سال بعد 1974ء میں وہ جیل سے باہر آئے۔ اس کے بعد 2013ء میں جب مصر کے ظالم فوجیوں نے ملک کی تاریخ میں منتخب ہونے والے پہلے جمہوری صدر محمد مرسی کی حکومت کا تختہ الٹا تو تمام اخوانیوں پر مظالم ڈھانے کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ 14 جولائی 2013ء کو پچاسی سال کی عمر میں آپ کو گرفتار کرلیا گیا۔ ان پر الزام یہ لگا کہ انہوں نے ملک میں عوام کو قتل عام پر ابھارا تھا۔ عمر قید کی سزا سنا کر انہیں جیل میں بند کردیا گیا۔ 89 سال کی عمر میں 22 ستمبر 2017ء کی شام اللہ کو پیارے ہوگئے۔ وہ جولائی 2013ء سے جیل میں تھے۔ وقت کے ظالم فرعون کا ظلم جاری، مگر اللہ کا وہ بندہ اپنا دور آزمائش مکمل کرکے اس امتحان میں سرخرو ہوکر اپنے رب کے حضور پہنچ گیا۔

خاص کام

خوش رہنا سیکھیں

نفسا نفسی اور مادہ پرستی کے اس دور میں جدید تہذیب کا ایک تحفہ ذہنی دباؤ بھی ہے۔ ہر انسان کو بہت سے مسائل کا سامنا ہے۔ بہت کم خوش نصیب ایسے ہوں گے جو اس کیفیت سے نہ گزرتے ہوں۔ یہ احساس کی ایک ایسی لہر ہے جس میں جکڑ کر نہ جانے کتنے لوگ اپنی الگ ہی دنیا میں گم نظر آتے ہیں۔ کالج میں، بازار میں، آفس میں غرض کتنے ہی ایسے چہرے آپ کو نظر آئیں گے جو فکر میں ڈوبے اور سوچتی آنکھوں سے معمول کا حصہ بنے ہوئے ہوتے ہیں۔ بظاہر سب کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی دنیا سے کٹے ہوئے محسوس ہوتے ہیں، غیر محسوس انداز میں اُن کی الجھن آمیز آنکھوں سے عیاں ہوتا ہے کہ زندگی ایسی سادہ تو ہرگز نہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ایسا صرف ان چند افراد کے ساتھ ہی نہیں بلکہ دانستہ یا غیر دانستہ یہ انسانی فطرت ہے کہ جب حالات اُس کی منشاء کے مطابق نہ ہوں تو گھبرا اُٹھتا ہے اور نا اُمیدی اور مایوسی میں گھرتا چلا جاتا ہے اور بعض اوقات یہ کیفیت اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ انسان خودکشی کے بارے میں بھی سوچنے لگ جاتا ہے۔

ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ہماری زندگی حاصل و لاحاصل کا مجموعہ ہے سب کچھ ویسا نہیں ہوتا جیسا ہم چاہتے ہیں اور بہت کچھ ایسا بھی ہوتا ہے جو ہمیں بن چاہے مل رہا ہوتا ہے۔ اگر دستیاب وسائل سے ہم لطف اندوز نہ ہوں اور اپنے ماضی کی تلخیوں یا مستقبل کے مسائل کو سوچ کر اپنے آج کو بلا مقصد گزار دیں تو یقیناً یہ ایک بڑا خسارہ ہے۔ کیونکہ بڑے سے بڑا حادثہ آخر کار ماضی کا حصہ بن جاتا ہے اور ماضی کبھی لوٹ کر نہیں آتا۔ کل کی بہ نسبت آج کا انسان زیادہ پریشان اور رنجیدہ دکھائی دیتا ہے۔ کل ہمارے پاس اگر اتنے وسائل نہیں تھے تو اتنے مسائل بھی نہیں تھے۔ وہ ہم سے زیادہ مشکلات کا سامنا کرنے کے باوجود ہم سے زیادہ خوش اور مطمئن نظر آتے تھے۔ اس کی اہم وجہ ہم خود ہیں۔ ہم جو حاصل نہیں ہے اسے چھوڑ کر جو حاصل ہے اس پہ غور کریں تو یقینا یہ بات بھی ہمارے لئے باعث اطمینان ہوگی۔ مانا کہ زندگی میں غم بھی آتے ہیں مگر یہ کیا کہ بس ہم انہیں کا رونا روتے خوشیوں کے مواقع کھودیں۔ جس طرح ہم چھوٹی چھوٹی پریشانیوں کو مناتے ہیں اگر خوشی کو منائیں تو یہ پریشانیوں کے لمحے ہمیں نظر ہی نہ آئیں۔ قرآن کی روشنی میں اہل ایمان کی خصوصیت یہی ہے کہ ان کی زندگی میں کوئی خوف یا رنج کا موقع نہیں۔ یہ زندگی اللہ کی ایک بہت بڑی نعمت ہے ہمیں اس کی قدر کرنی چاہئے اور ذہنی دباؤ جیسے خود ساختہ مسائل سے باہر نکل کر ایک خوشگوار زندگی کی اساس ڈالنی چاہیے۔

شیخ فاطمہ بشیرا، ممبرا

حارث اپنے والدین کا بڑا بیٹا، نویں کلاس کا طالب علم، پڑھائی میں ہوشیار، صوم وصلوٰۃ اور قرآن کا پابند، کھیلوں میں اوّل، تقریری وتحریری مقابلوں کی جان، اپنے والدین کا فرمانبردار، بہنوں کا مان، دوستوں کا ہمدرد، اساتذہ کی آنکھوں کا تارا، ایک ہونہار اور نیک صفت بچہ تھا۔ والدین کی خواہش تھی کہ ان کا بیٹا جج بنے اور انصاف کے مطابق فیصلے صادر کرے۔ حارث سے دو سال چھوٹا خالد، بڑے بھائی کے برعکس نہایت شریر، جسے پڑھائی سے نہ کوئی رغبت تھی نہ مستقبل کی کوئی فکر۔ وقت کی بربادی اس کا بہترین شغل تھا۔ اساتذہ کی باتیں ماننا تو درکنار، والدین کی بات سننا بھی اسے گوارا نہ تھا۔ حارث اور اس کی بہنیں ہمیشہ اسے سمجھانے کی کوشش کرتے لیکن اپنی من مانی کرنا گویا اس کا فرض تھا۔ حامد صاحب ہمیشہ اولاد کی تربیت کے معاملے میں ایک شفیق باپ تھے۔ اس لئے وہ خالد کو کبھی پیار سے تو کبھی ڈنڈے کے زور پر سمجھانے کی کوشش کرتے لیکن وہ ان کی پیار بھری نصیحتیں بھی سنی اَن سنی کر دیتا۔ حارث کی طرح خالد بھی ان کا بچپن میں نہایت ذہین اور ہر مقابلوں میں اوّل مقام حاصل کرنے والا ہوشیار بیٹا تھا۔ لیکن بڑی جماعت میں آنے کے بعد برے دوستوں کی صحبت نے اسے مکمل بدل کر رکھ دیا۔ اسے نماز، قرآن اور پڑھائی سے دور اور والدین کا نافرمان بنا دیا تھا۔ نتیجتاً کلاس میں اوّل آنے والا بچہ، تین مرتبہ نویں جماعت میں فیل ہونے کے بعد اسکول سے باہر کر دیا گیا تھا۔ حامد صاحب خالد کو ایک بہادر اور بے باک صحافی کے روپ میں دیکھنا چاہتے تھے لیکن اِسکی عادتوں نے ان کی اُمیدوں پر پانی پھیر دیا۔

جوں جوں دِن گزرتے گئے، خالد کی آوارہ گردی بڑھتی ہی چلی گئی۔ اِسکی عادتوں کے بگاڑ میں اُسکے دوستوں کا بڑا ہاتھ تھا۔ پھر ایسے بھی دن آئے جب خالد اور اُس کے ٹولے کو رات سڑکوں پر بیٹھنے کے جرم میں جیل کی ہوا بھی کھانی پڑی۔ لیکن حامد صاحب کے اثر ورسوخ نے اسے ایک یا دو دِن میں جیل سے چھٹی دلوادی۔ اس کے باوجود خالد کی عادتیں بدلنے کی بجائے پختہ ہوتی چلی گئی۔ دوسری طرف حارث پڑھائی پر توجہ دیے، سب کا خیال رکھتے ہوئے فرائض کی پابندی کے ساتھ اور والدین کی دعائیں ہمراہ لیے کامیابی سے اپنا سفر طے کرتا چلا جا رہا تھا۔ بڑا بھائی ہونے کے ناطے حارث ہمیشہ اسے سمجھاتا رہا لیکن خالد کے کانوں پر جوں تک نہ رینگتی۔ بری لت اور آوارہ گردی سے اسکی شخصیت مسخ ہوگئی تھی۔ جوان اولاد کی بگڑتی عادتوں نے حامد صاحب کو اندر ہی اندر گھلا ڈالا اور ایک دِن دِل کا دورہ پڑھنے کے بعد وہ خاموشی سے اس جہاں سے رخصت ہوگئے۔ شفیق باپ کی وفات سے بھی خالد پر کوئی اثر نہ ہوا اور اس کی زندگی اسی نہج پر رواں دواں رہی۔

حارث ایک کامیاب جج بن چکا تھا اور یہ اس کی محنت، اللہ کی مدد اور والدین کی دعاؤں کا ثمرہ تھا کہ آج وہ ملک کی سب سے بڑی عدالت میں جج کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ پھر گردشِ ایام میں ایسا وقت بھی آیا جب حارث کو اپنے بھائی کے خلاف فیصلہ سنانا پڑا۔ ہوا یوں کہ خالد کے ٹولے نے ایک وزیر کے گھر ڈاکہ ڈال کر بڑے پیمانے پر مال وزر اُڑا لے گئے۔ نتیجتاً یہ فیصلہ سپریم کورٹ پہنچا جہاں حارث نے ایک انصاف پسند جج ہونے کے ناطے پورے گروہ کو پانچ سال جیل بامشقت کی سزا سنائی۔

چھوٹے اور لاڈلے بیٹے کی عادتوں کی فکر میں گھلتی ان کی والدہ کی روح بھی رب پرور کی جانب پرواز کر گئیں۔ جیل میں والدہ کی وفات کی خبر نے خالد کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ آج اسکا ضمیر اسے مسلسل کچوکے لگا رہا تھا۔ شدت سے اپنی غلطی کا احساس، کانوں میں گونجتی باپ کی نصیحتیں اور ماں کا آنسوؤں سے تر چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم رہا تھا۔ سر ہاتھوں میں گرائے اور ندامت وشرمندگی کے آنسو بہاتے ہوئے اس نے کئی گھنٹے گزار دیے۔ جب کچھ ہوش آیا اور وقت کا اندازہ ہوا تو دِل کے گوشے سے ضمیر نے آواز لگائی کہ اللہ کے حضور پلٹ اور اُس سے بخشش طلب کر۔ آج کئی سالوں بعد جب اس نے نماز کی نیت باندھی تو ایک سکون سا دِل میں اُترتا چلا گیا اور نماز کے بعد بہت دیر تک وہ ہاتھ اُٹھائے اپنے رب سے دعائیں مانگتا رہا۔

یوں دِن گزرتے جا رہے تھے۔ آخر اس کی رہائی کا دِن بھی آپہنچا۔ حارث نے کبھی اپنے بھائی کو لاوارث نہ چھوڑا تھا اور اِسی لیے آج بھی وہ خالد کو لینے جیل آپہنچا۔ جوں ہی خالد کی نظر اپنے بھائی پر پڑی احساسِ ندامت سے اس کا سر جھکتا ہی چلا گیا۔ کھانے کے بعد کمرے میں داخل ہوتے وقت جیسے ہی خالد کی نظریں اپنے تمغات پر پڑی تو آنکھوں سے اشکوں کا ایک دریا بہہ نکلا۔ ہر چیز اس کے ہاتھ سے نکل چکی تھی۔ وقت برباد ہوگیا۔ والدین پریشان اور دِل میں درد لیے اِس دنیا سے رخصت ہوگئے۔ غلط طریقوں سے پیسہ حاصل کرنے کی کوشش میں کئی بار اسے جیل کی ہوا کھانی پڑی، نہ علم ملا، نہ دین اور نہ ہی دنیا سنور سکی۔ لوگوں میں بدنامی اور نفرت پھیل گئی۔ غرض کوئی اچھائی ہاتھ نہ آئی، صرف پچھتاوا باقی رہ گیا۔

دیکھا بچو! آپ نے خالد نے ماں باپ کا کہنا نہ مانا، اساتذہ کی عزت نہ کی، اللہ کی باتوں کو نہ سنا، فرائض کی پابندی نہ کی، علم کی اہمیت کو نہ جانا، پڑھائی سے منہ موڑا تو اسے نہ ہی دولت وشہرت ملی اور نہ ہی علم وترقی۔

تو پیارے بچوں ہمیشہ یاد رکھو کہ والدین کی خدمت اور ان کی دعائیں ہماری دنیا بناتی ہے اور آخرت بھی سنوار دیتی ہے۔ باپ کی عزت جنت کا دروازہ اور ماں کا احترام بہشت ہے۔ اللہ میاں نے قرآن میں کہا کہ ''نہ انھیں اُف کہو اور نہ جھڑکو، بلکہ ان سے تعظیم سے بات کرو'' اور ہمیں اپنے والدین کے لیے دعا کرتے رہنا چاہئے۔ رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا (اے میرے رب اِن دونوں پر رحم فرما جیسے اُنھوں نے مجھے بچپن میں پالا)۔

یوم القدس کا انعقاد

گزشتہ دنوں امریکی صدر ڈونالڈ ٹرمپ نے یروشلم کو اسرائیل کی راجدھانی بنانے اور امریکی سفارت خانہ کو تل ابیب سے یروشلم منتقل کرنے کا جو اعلان کیا ہے وہ امریکہ اور اسرائیل کے مذموم مقاصد کا حصہ ہے جس کے خلاف دنیا بھر کے مسلمان اور انصاف پسند عوام آواز اٹھا رہے ہیں۔ کسی ملک میں صدیوں سے رہتی بستی آبادی کو کسی مفروضے کی بنیاد پر تہہ وبالا کر کے اس آبادی کی جگہ دنیا بھر میں منتشر مخصوص آبادی کو لاکر بسانا کیسے درست ہوسکتا ہے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ پوری دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکتے ہوئے فلسطین اور اہل فلسطین کے ساتھ ایسا ہی کیا گیا۔

یہودیوں کی فلسطین میں آبادکاری کا منصوبہ ایک کھلی صہیونی سازش ہے اور اس سازش کے نتیجہ میں فلسطین میں صدیوں سے آباد عوام کو بے گھر کر کے ان کی جگہ دنیا بھر کے یہودیوں کو لاکر غیر قانونی طور پر بسایا گیا اور اسی سازش کے نتیجہ میں ہی مسلمانوں کا قبلہ اوّل مسجد اقصیٰ بھی یہودیوں کے نشانہ پر ہے، وہ کبھی وہاں آگ لگا دیتے ہیں، کبھی غیر قانونی کھدائی شروع کردیتے ہیں اور کبھی وہاں نماز پڑھنے سے لوگوں کو روکنے لگتے ہیں۔ حالانکہ دنیا بھر کے مسلمان اس مقدس مسجد سے مضبوط مذہبی اور جذباتی تعلق رکھتے ہیں۔ اس سازش کے نتیجہ میں گزشتہ ایک صدی سے بنیادی انسانی حقوق اور اعلی اخلاقی اقدار بری طرح سے پامال ہورہی ہیں اور دنیا بھر میں آزادی، حقوق انساں اور جمہوریت کے خود ساختہ علمبردار ہی اس پامالی کا سبب بن رہے ہیں۔ اس سازش میں یہودیوں کو وقت کی عالمی طاقتوں بالخصوص امریکہ اور برطانیہ نے کھلے طور پر اپنا ناجائز سپورٹ فراہم کیا اور مسلم دنیا کے بیشتر ممالک نے مجرمانہ خاموشی کا رویہ اختیار کیا اور اب بھی ان ممالک کا عمومی رویہ یہی ہے۔

اسی ضمن میں ایس آئی او نے اس سازش کے خلاف اور فلسطین اور مسجد اقصیٰ کی حمایت میں 22 دسمبر بروز جمعہ کو یوم القدس منایا اور ان کی حمایت میں ملک کے طول وعرض میں ایک خاموش احتجاج کیا اور یہ پیغام دیا کہ جس طرح فرانس اہلِ فرانس کا اور برطانیہ اہل برطانیہ کا ہے اسی طرح فلسطین اہل فلسطین کا ہے اس پر زور زبردستی اور ناجائز طریقے سے قبضہ کرنے کی ہر کوشش ناکام ہوگی۔

اسرائیلی وزیر اعظم نیتن یاہو کے ہندوستانی دورہ کے خلاف مظاہرہ

اسرائیلی وزیر اعظم نیتن یاہو کے ہندوستانی دورے کے خلاف مختلف تنظیموں کے ساتھ مل کر ایس آئی او نے ۱۵ر جنوری کو اسرائیلی سفارت خانہ کے باہر ایک احتجاجی مظاہرہ کیا۔ اس موقع پر ایس آئی او کے نیشنل سکریٹری برادر لبید شافی اور برادر سید اظہر الدین نے مظاہرہ سے خطاب کیا اور اپنا احتجاج درج کراتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ ہندوستان ہمیشہ سے فلسطین کی حمایت میں رہا ہے اور آئندہ بھی رہے گا، ہم اسرائیلی وزیر اعظم کے دورہ ہند کی پرزور مذمت کرتے ہیں۔ اس سے قبل صدر تنظیم ایس آئی او آف انڈیا نے صدر جمہوریہ ہند کو ایک خط لکھ کر یہ مطالبہ کیا کہ اسرائیلی وزیر اعظم جو کہ فلسطین میں ہورہی ہے ظلم و بربریت کے ذمہ دار ہیں اور ہندوستان ہمیشہ سے فلسطین کی حمایت میں رہا ہے لہٰذا فلسطینیوں سے اظہار یکجہتی کیلئے اسرائیلی وزیر اعظم کا دورہ ہند منسوخ کیا جائے۔

ایس آئی او ممبئی کی جانب سے تربیت گاہ کا انعقاد

ممبئی، ایس آئی او ممبئی کی جانب سے طلبہ ونوجوانوں کے لیے ایک چار روزہ تربیت گاہ کا اہتمام کیا گیا۔ کیمپ کا مرکزی عنوان ''اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ کیمپ کا آغاز سورہ مجادلہ کے آخری رکوع کے ''درسِ قرآن'' سے کیا گیا۔ مہمانانِ خصوصی کے طور پر جناب اعجاز احمد اسلم صاحب (رکن مرکزی مجلسِ شوریٰ، جماعت اسلامی ہند) جناب توفیق اسلم خاں صاحب (امیر حلقہ مہاراشٹر)، جناب ڈاکٹر سلیم خاں صاحب (رکن مجلس شوریٰ حلقہ مہاراشٹر)، جناب ظفر انصاری صاحب (سکریٹری برائے شعبہ خدمتِ خلق جماعت اسلامی ہند) اور جناب عبدالمجیب صاحب (امیر مقامی جالنہ)، برادر سلمان احمد (صدر حلقہ مہاراشٹر، ساؤتھ زون) موجود رہے۔

کیمپ کے پہلے دن درسِ قرآن سے پروگرام کی شروعات کی گئی، جس میں مقرر نے اقبال کے کلام سے منتخب اشعار کی تفہیم کروائی۔ دوسرے دن دنیا سے بے ثباتی، رسولؐ کی قیادت اور علمی وفکری ارتقاء کی اہمیت وضرورت جیسے عنوانات موضوعِ سخن بنے۔ علاوہ ازیں تعلیمی یا پیشہ ورانہ زندگی اور تنظیمی سرگرمیوں میں اعتدال جیسے عملی موضوع پر بھی روشنی ڈالی گئی۔ تحریکِ اسلامی ہند کی نمایاں شخصیات جو کہ حرکت وعمل اور حرارتِ ایمانی کا چلتا پھرتا نمونہ تھیں ان میں سے دو اہم شخصیات مولانا ابواللیث ندویؒ (سابق امیر جماعت اسلامی ہند) اور مولانا عبدالقیومؒ (سابق سکریٹری جماعت اسلامی ہند) کی زندگی کے حالات پیش کیے گئے۔ تیسرے دن ''اہلِ ایمان کی سماجی ذمہ داریاں''، تنظیمی شعور اور قرآن مجید کا دعوتی اسلوب جیسے عناوین کے تحت ذمہ دارانِ تنظیم وتحریک نے رہنمائی کا سامان کیا۔ مہمانان کے ذریعہ پینل ڈسکشن سے استفادہ کیا گیا جس میں ''تعیش پسندانہ زندگی اور اس کا سدِ باب'' پر شرکاء کے سوالات اور اس کے اطمینان بخش جوابات فراہم کیے گئے۔

آخری دن تصحیح قرآن کے حلقے بنائے گئے اور مشق کی گئی۔ بعد ازاں ''خرابیِ نفس کے اسباب اور اس کا علاج'' اس اہم موضوع کے تحت تین ذیلی عناوین پر گفتگو کی گئی۔ اختتامی خطاب بعنوان ''اسلام: انسانیت کے لیے واحد راستہ کے موضوع پر برادر سلمان احمد (صدر حلقہ مہاراشٹر ساؤتھ زون) نے کیا۔